آج

افسانے

انور سجاد

آج

افسانے: انور سجاد

طبع اول
موسم بہار ۱۹۸۲ء

ناشر : جمیل النبی
تزئین : انور سجاد
کتابت : ممتاز احمد
پرنٹر :

[redacted] 25/-

یکے از مطبوعات:
مکتبہ عالیہ ۰ لاہور
آفس: ایبک روڈ انارکلی لاہور
شوروم: اردو بازار لاہور

بلالؓ حبشی

اور دُنیا بھر کے غلاموں کے نام

انسان آزاد پیدا ہوا ہے، پھر وہ زنجیروں میں کیوں جکڑا ہے ـــ روسو کا انقلابی سوال!

انسان زنجیروں میں جکڑا پیدا ہوا ہے، پھر وہ ان زنجیروں کو توڑنے پر کیوں تُلا ہے۔ ایک غیر انقلابی سوال؟

کہانی اور استعارہ

کسی نے حضرت بہاؤالدین نقشبند رحؒ سے پوچھا

"آپ ہمیں کہانیاں سناتے ہیں۔ پر یہ نہیں بتاتے انہیں سمجھیں کیسے"؟

انہوں نے جواب دیا

"تم جس شخص سے پھل خریدنے جاؤ، اگر وہ شخص تمہاری آنکھوں کے سامنے پھل تو خود کھالے اور چھلکے تمہارے حوالے کر دے تو تم کیا محسوس کرو گے؟

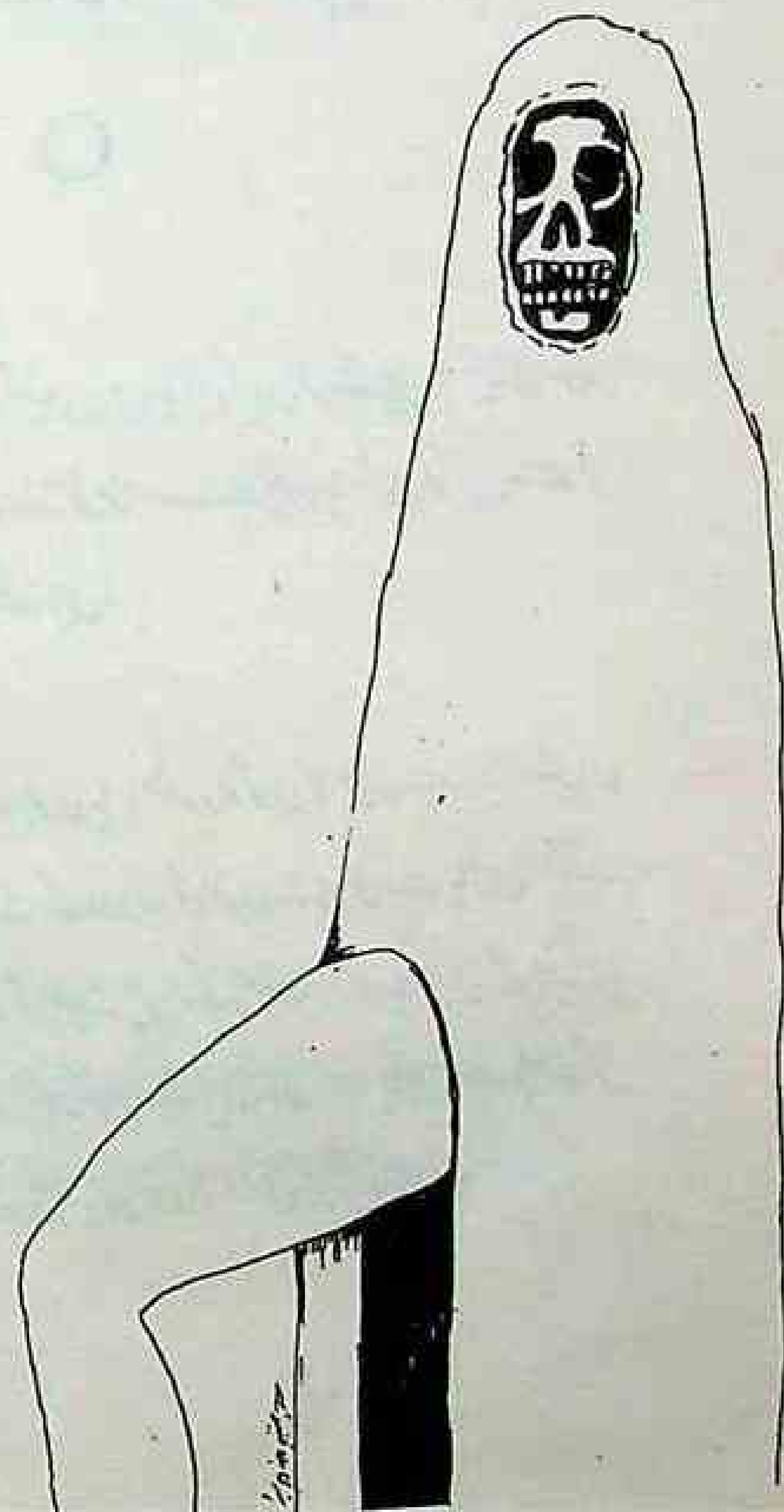
○

کسی مولوی نے صوفی سے پوچھا

"آپ لوگ ہمیشہ استعاروں، تمثیلوں میں باتیں کیوں کرتے ہیں؟ خیال کے اظہار کی یہ صورت جاہلوں کے لئے تو مناسب ہے لیکن باشعور لوگوں سے تو آپ سیدھی صاف بات کہہ سکتے ہیں۔"

صوفی نے کہا

"تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مسئلہ جاہلوں یا باشعور لوگوں کا نہیں ہے۔ یہ مسئلہ ان لوگوں کا ہے جنہیں کسی حقیقت کے ادراک کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی حقیقت کے ادراک کے کسی حصّے کی بھی۔ تو ہمیشہ یہی لوگ استعارے یا تمثیل کے بغیر کسی بھی بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان سے بلا واسطہ بات کرو تو وہ اپنے اور حقیقت کے درمیان خود کو حائل کر لیتے ہیں۔"



ترتیب

گنگرین

مرگی

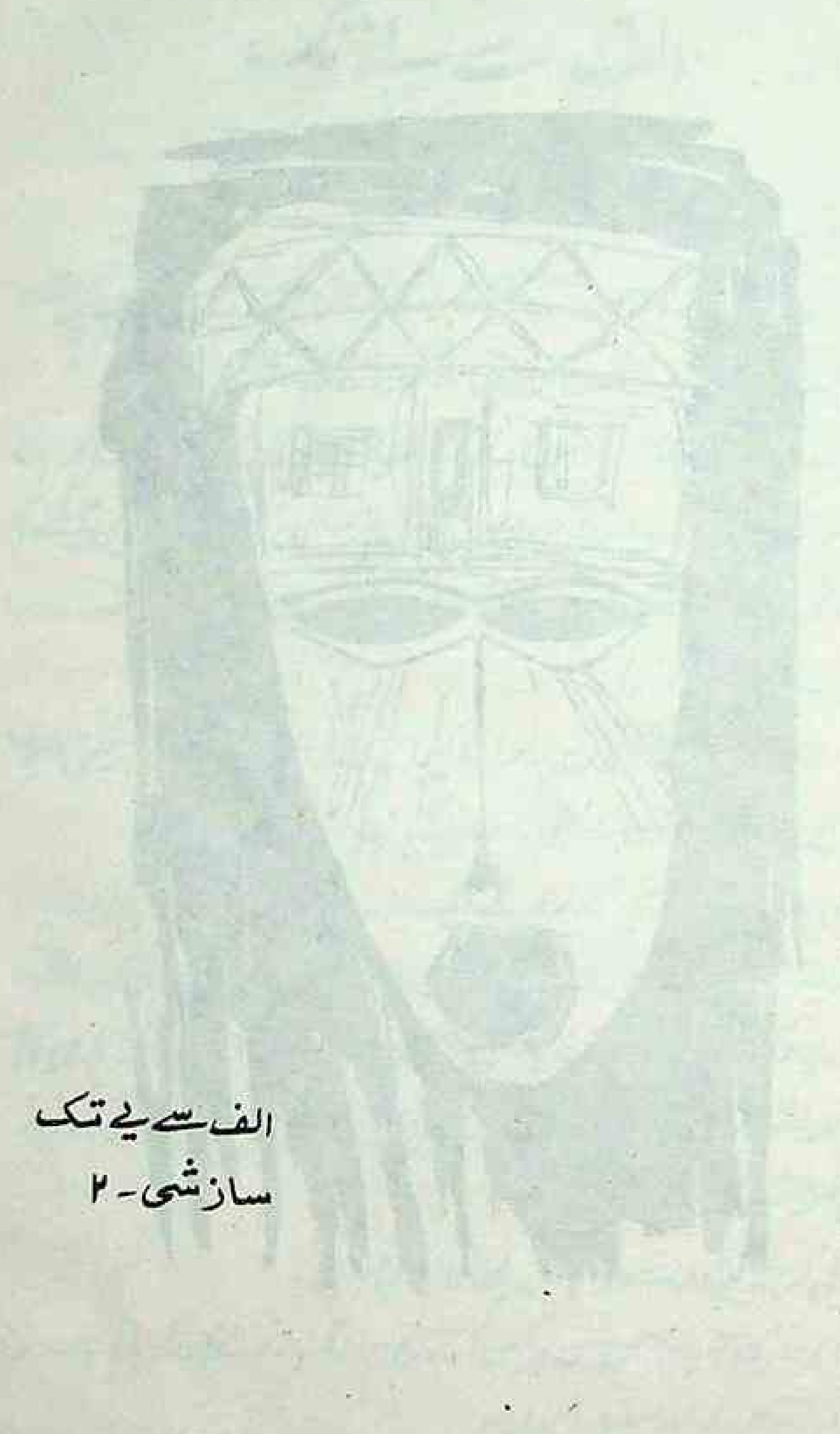
ریبیز

آج ۱–۸

سیاہ رات

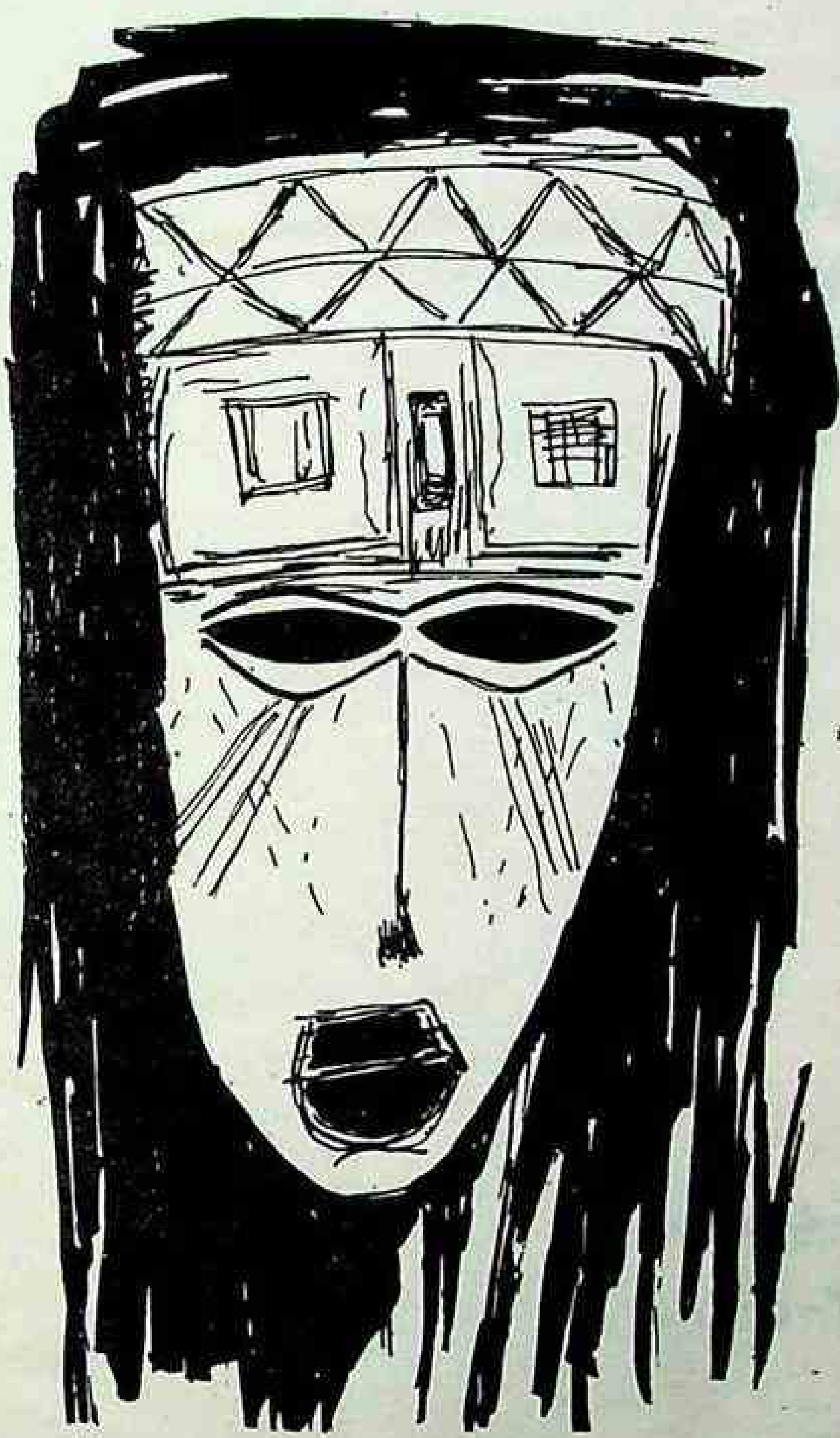
خوشیوں کا باغ: ۱–۲

خوشیوں کا باغ: ۳



الف سے یے تک

سازشی - ۲



الف سے یے تک

محمود درویش

ہم نے کہا

یہ تو لفظوں کی محض ایک خاص ترتیب تھی کہ جس سے طوفانوں کے جنم کے علاوہ اور کچھ مقصود نہ تھا یا پھر بجلیاں کہ جو گھنے تاریک جنگلوں میں پنپتی سازشوں کے راز افشا کر دیتی ہیں۔

وہ کیوں دشمنی پر تل گئے جب انہوں نے سنا کہ ندیاؤں میں پانی کے علاوہ اور بہت کچھ بہتا ہے، بہت کچھ، ان پتھروں کے علاوہ کہ جو وادیوں میں پھیلتے سایوں کو اپنے وجود میں سمیٹنے کی خواہش لیے مٹی ہو کر بہہ گئے کہ جیتے جاگتے مجسموں کی تراش ان پتھروں کے مقدر سے چھین لی گئی ہے۔

اذیت۔ جب یہ کہا گیا کہ جنگلوں کی پراسرار تاریکیوں کے راز افشا کرتی، کوندتی، لپکتی بجلیوں کے نطفوں کو کچل کر، بانجھ حقیقتوں کے بطن سے جنایا گیا ہے۔

تب بھی چاند کے گلے پر خنجر تھے کہ ہم نے ایک دوسرے سے عہد کیا تھا، ہم ایک ایک گھر کے ایک ایک تاریک کونے میں سورج کی کرنیں سجائیں گے تو پھر ہم کیوں زخمی فاختہ کے خون کو پتھروں پر سوکھتا چھوڑ کر چلے آئے؟ اس لیے کہ ہمارا وجود، ہمارا کنبہ، ہمارا گھر، ہماری گلی ہمارا گاؤں، ہمارا شہر، ہمارا ملک پسینے سے بنی زنجیر ہے جس میں ہم صدیوں سے جکڑے اپنے چوراہوں میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر منجمد ہو گئے؟

اور تاریکی کہ جو بھیڑیوں سے ہوا چھین لینے والی تاریکی ہے۔

— قصور اس آئینے کا ہے، جس میں ہر عکس آ کے مسخ ہو جاتا ہے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

— یہی تو ہم کہتے ہیں کہ ان مستعار آئینوں کو

— سو اپنے گلوکاروں سے کہہ دو، اپنے راگ الاپنے بند کر دیں، ورنہ ہم ان کی ڈفلیاں پھاڑ

دیں گے۔

ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، وہ معدوم ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنی آنکھیں کھول لیتے ہیں، انہیں موجود پاتے ہیں۔

آنکھیں بند کرنے کھولنے کے کھیل سے وہ محظوظ ہوئے۔ پھر بھی وہ لفظ، لفظوں کی ترتیب، حلق سے نکلتے لفظوں کی آواز کا آہنگ، کاغذوں پر انز کے چلتے پھرتے، سانس لیتے پھلتے پھولتے لفظوں کی زندگی سے وہ خوفزدہ تھے۔ ہمیں آنکھیں بند کرنے، کھولنے، بند کرنے کھولنے کے کھیل میں مصروف پاکر انہوں نے حکم دیا۔

الف سے یے تک تمام لفظوں کو بیڑیاں پہنا کر عمر بھر کے لئے زنداں میں ڈال دو کہ اس سے خاموشی طویل ہو گی اور تحفظ دائمی۔

بجلیاں کوندیں اور ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے گھنے، تاریک، سازشی جنگلوں کا جائزہ لیا۔

—— سنو، طوفانی ہوائیں ہتھیاروں کے واروں سے زخمی نہیں ہوا کرتیں۔ ہمارا ایک ایک لفظ اپنے سینے پر لاکھوں پھول اگاتا ہے۔ ساون کے تمام بادل مل کر بھی اتنا مینہہ نہیں برسا سکتے کہ ہمارے لفظوں کے سینے سیراب ہو سکیں۔

اخباروں، کیلنڈروں، پکچر کارڈوں پر چھپی ان کی تصویریں صاف شفاف، اجلی اجلی، واشنگ پاؤڈر سے دھلی۔

جب ہم تاریک جنگلوں میں پنپتی سازشوں پر پڑے مسکراہٹوں کے پردے کی طرف کوندتی بجلیوں کو ہاتھوں میں تھام کر بڑھے تو وہ چیخ اٹھے۔

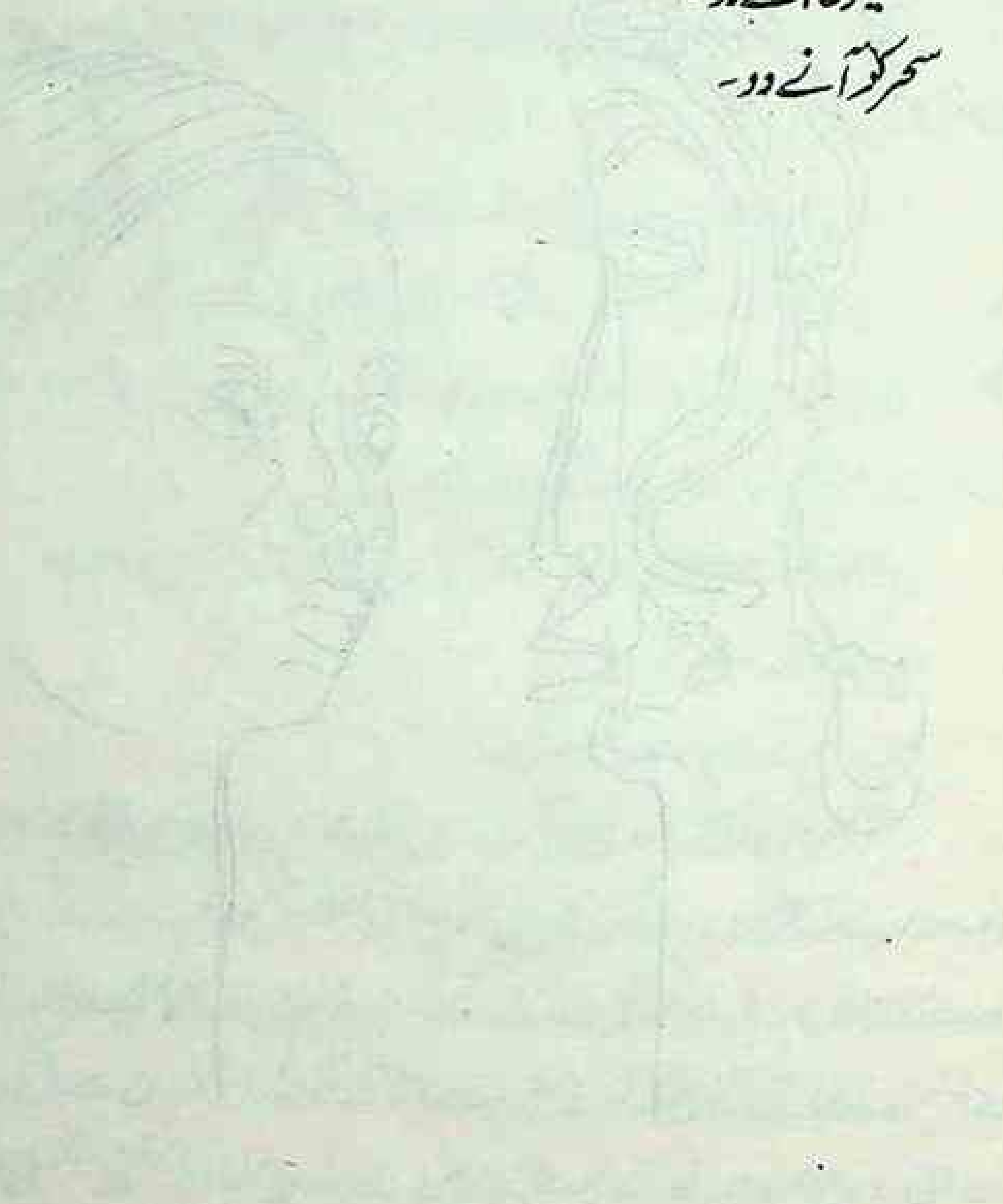
—— گارڈز، گارڈز، لفظوں کو گولی سے اڑا دو۔

لیکن قربان گاہ تو وہ جگہ ہے جہاں مجنتوں کے لفظ مرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

بجلیاں اور زندانوں میں قید؟

لفظ تو سورج کی منطق، تاریخ کی ندیاں ہیں۔ مزاج، لفظ، درخت کہ جن زمینوں میں فنا کر دیئے جاتے ہیں ان ہی زمینوں میں ان کی لاشوں سے پھر کونپلیں پھوٹتی ہیں۔

لہو میں ابلتے لفظوں کی آواز سائیکلونوں کو لگتی، چوراہوں کے پتھر چیختے، زخموں کے دہانے۔
تب ہم ہنسے اور جسم لیتے سائیکلونوں کا سواگت کیا۔
جب انہوں نے ہماری ہستی کے سامنے خنجر گاڑنا چاہے تو ہم نے ان کے ہاتھوں پر وار
کئے اور ان کی استخوانی انگلیوں میں پھنسی کنجیاں چھین لیں اور اپنے زخموں سے لپکتے شعلوں
کی روشنی میں اس کال کوٹھڑی کی جانب چل دیئے جہاں انہوں نے سحر کو قید کر رکھا تھا۔
ہم کتنے پیچھے تھے جب ہم نے سائیکلونوں کی صدا پہ لبیک کہا۔
سائیکلون آنے دو۔
سحر کو آنے دو۔





سازش - ۲

ایک زمانہ ہوا،
ہم چھوٹے سے ٹیلے پر ستانے کے لئے بیٹھے تھے۔
ہوں، ہم نے سوچا۔ ہم اپنے لئے نہر کھود رہے ہیں جو ہماری زمین سے ہمارے لئے زندگی اگائے گی۔
رائفلوں والے پہرے دار ہر وقت ہمارے سروں پہ منڈلاتے رہتے تھے۔ ہمیں سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی کہ یہ کس کے لئے، کس کی حفاظت کر رہے تھے۔ ہم تو بس آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے دنیا جہان کی باتیں کرتے، چپ چاپ، سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں بھر بھر کر ٹرکوں میں ڈالتے رہتے تھے۔
ہم آزاد تھے، صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا تھا کہ ہم قید میں ہیں۔
ہوں، ہم نے سوچا۔ ہماری نہر۔
ہوں۔ ہم نے سوچا۔ ہماری زندگی۔
سرِ شام ہی ڈھلتے سورج کی آخری کرنیں تھامے ہم بند لاری میں بیٹھے لوٹ رہے تھے اور ایک دوسرے کے جسموں پر بھاگتی نیلی پیلی، سبز، لال سلاخوں کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے تھکے ہارے کاندھوں پہ ہمارے سر فخر سے تنے تھے کہ ہر روز ہم اپنے لئے، ایک دوسرے کے لئے وہ نہر کھودنے جاتے تھے جو کر اپنے بطن سے اترتے، کروڑوں قطروں سے مل کر بنے دریاؤں کے پانی سے لبالب بھرنے کے بعد ہماری زمین سے ہماری لہلہاتی، مہکتی، شگفتہ زندگی کو جنم دے گی۔
روشنیاں

لاری کی بتیوں کی روشنی میں تانگے میں بیٹھی لڑکیاں نظر آئیں۔ ہنگامی ٹریفک کے باعث لاری کی رفتار تانگے کے پیچھے آکر تانگے ایسی ہو گئی تھی۔ روشن لڑکیوں نے ہمارے جسموں پر چھاگئی نیلی پیلی، سبز، لال سلاخیں شناسی دیں۔ لڑکیاں تانگے میں کچھ ایسے بے ڈھنگے پن سے بیٹھی تھیں جیسے موٹر کار میں بیٹھنے کی عادی ہوں اور محض سرد شام کی کپکپاہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے رونگٹوں میں جگانے کے لئے تانگے کی سواری چنی ہو۔

ہم تو جوان انہیں دیکھ کر کھل کر مسکرائے۔ بوڑھا ہماری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

لڑکیوں نے شاید ہماری نظروں اور مسکراہٹوں کی سنسناہٹ کو ڈھانپنے کے لئے اپنے گرم سر ڈسیوں پر گرم گرم چادریں سرکالیں۔

ہم میں سے وہ، جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی تھیں، اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھا۔ بوڑھا اس کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور حیران تھا کہ لڑکا باہر کے موسم سے اتنا بے خبر ہے! یا اتنا باخبر ہے! یہ لڑکا کہ جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی ہیں۔

——— لڑکیاں۔

ہمارے منہ سے بھاپ نکلی اور ہماری آنکھوں پر چھاگئی۔ ہم نے اپنی کھردری اون سے بنی صدریوں سے اپنے جسموں کو اور بھی جکڑ لیا۔ سلاخوں والی بند لاری میں ہونے کے باوجود سرد شام ہمارے رونگٹوں میں بھی کپکپانے لگی تھی۔

ان لڑکیوں کو دیکھ کر ہمارے سر فخر سے اور بھی تن گئے کہ ہم وہ نہر کھود رہے تھے، جس کا بطن کہ جب کروڑوں قطروں سے مل کر بنے دریاؤں کے پانی سے بھر جائے گا تو ہماری زمین سے ہمارے لئے، سب کے لئے لہلہاتی، مہکتی، شگفتہ زندگی اگائے گی۔

ہم نے لڑکیوں کو بھی اپنی طرف دیکھ کر مسکراتا محسوس کیا اور ہم نے سوچا، ہم یہ نہر بہت جلد مکمل کر لیں گے۔

——— قیدی!

تانگے کی پچھلی گدی پر بیٹھی ایک لڑکی نے اچانک دوسری لڑکی سے قریباً چیختے ہوئے کہا۔ تانگے میں بیٹھی تمام لڑکیوں کی آنکھیں ہماری جانب اٹھیں۔ حیرت، ترحم اور تجسس ان

آنکھوں سے نکل کر ہمارے جسموں کو پسینہ پسینہ کر گئے اور نیلی، پیلی، سبز، لال روشنیاں ہمارے جسموں پر پھر سردی سے لرزنے لگیں۔ چند ایک کے منہ سے بھاپ کی صورت لفظ نکلے۔

— ہائے قیدی! واقعی!

قیدی؟ ہم حیران رہ گئے۔ ہمارے تھکے ہارے کندھوں پر فخر سے تنی گردنیں تھک ہار سی گئیں اور سردی میں ٹھٹھرتی نیلی، پیلی، سبز، لال روشن سلاخوں کی گرفت کھردری اون کی صدریوں میں کانپتے جسموں کے گرد اور بھی مضبوط ہو گئی۔

تانگہ ایک طرف ہو گیا۔ ہماری لاری آگے بڑھ گئی۔

ہم چپ تھے، جیسے لڑکیوں کے منہ سے نکلتی بھاپ نے ہم سب کو ڈس لیا تھا۔

ایک سے رہا نہ گیا۔ اس نے بے چینی سے کہا۔

— ہم!

— ہماری زمین!

دوسرے نے سرد ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارتے ہوئے کہا۔

— میرا شہر!

تیسرے نے آنکھیں بند کر لیں۔

— آہ، بیٹے! یہ سب سالا ہیچ پوچ ہے۔

— دلی! چاندنی چوک، جامع مسجد، لال قلعہ۔

— امرتسر! گھنٹہ گھر، ہال بازار، دربار صاحب۔

— ہنہ، سکھ دا پتر۔

پر ہم میں سے کوئی بھی مسکرا نہ سکا۔

— میرا شہر! لاہور، لاہور اے۔

— دما دم مست قلندر، سخی شہباز قلندر۔

اس کی صحرائی آواز زیرِ لب بھی بہت سریلی تھی۔

سنگلاخ چٹانوں سے تراشے ہوئے وہ کڑیل جوان چپ تھے اور لاری کے دروازے پر

بیٹھے رائفلوں والے پہرہ داروں کو گھورے جا رہے تھے۔ چند لمحے صرف لاری کے انجن کی آواز پھر وہ شخص جسے ہم بھالو کہتے تھے، باری باری سب کو ایک نظر دیکھنے کے بعد بول اٹھا۔

—— نہیں نہیں۔ شوب بھالو۔ شوب بھالو آپ چھے۔ شوب اچھا۔ اپنا شونار جو بین، شونار دیش، اپنی نہر، شوب کی ندیا، شوب کے دریا۔ بس ذرا جو لدی جو لدی ——

بھالو کے جملے کے اختتام سے پہلے ہی ہم میں سے ایک نے اس کی انگلیوں میں سلگتی بیڑی اڑا کر اپنے دانتوں میں دبالی۔ اسے ہر شے بھالو لگتی تھی۔ بہت اچھی لگتی تھی، اور وہ خود اتنا بھالو تھا کہ ہم اس کا بیشتر راشن بھی اس سے لے لیا کرتے تو وہ مسکرا دیا کرتا۔

—— کوئی بات نہیں۔ بھالو آپ چھے۔ شوب اپنا، شوب تمہارا۔

اور جانے اس کی گفتگو سے اس کی بیڑی کا کیا تعلق تھا کہ اس کی گفتگو کے دوران اگر کوئی اس سے اس کی سلگتی بیڑی لے لیتا تو وہ اسی دم چپ ہو جاتا تھا۔ یوں بھی معمول کچھ ایسا تھا کہ جب بھی اسے کوئی بات کہنے کا موقع ملتا اور وہ فوراً بیڑی سلگا کر دانتوں میں دبا لیتا تو بھی ہم سب اس کی طرف سے کان لپیٹ لیتے تھے۔ وہ بیڑی کو چباتا، کش لگاتا بولتا رہتا اور جب بھی اسے چپ کرانا مقصود ہوتا تو ہم میں سے کوئی اس کی بیڑی اڑا لیتا۔

اور اب لاری کی گھوں گھر کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

اب ہم پھر چپ تھے، اپنی اپنی سوچوں میں گم نئی نئی پھوٹی مونچھوں والے اس لڑکے کی طرح جو بوڑھے کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔

ہم میں سے ایک کے دانتوں میں بھالو کی بیڑی دیکھ کر بوڑھا مسکرایا۔ زمانوں کی ذہانت، علم، تجربہ اور شعور اس کی جھریوں میں سمٹ آیا۔ اس نے برفیلی فضا کو توڑنے کی غرض سے اپنے سامنے بیٹھے لڑکے سے پوچھا۔

—— ہیں ؟

نئی نئی پھوٹی مونچھوں والے لڑکے نے پوچھا

—— ہیں ؟ ہیں کہاں ہوں ؟

ہم سب ہنس پڑے۔

لڑکا جھینپ گیا اور ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبا۔

— میں موئنجو داڑو میں تھا۔

بوڑھے نے کہا۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

— اور رنگا متی، مینا متی۔

اس کی حسب معمول کسی نے نہ سنی۔ اس نے اپنی صدری سے نئی بیڑی نکال کر سلگالی۔

— موئنجو داڑو میں؟

بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا، اس کے چہرے کی جھریاں اور بھی گہری ہو گئیں۔ بھالو کی آنکھیں اور بھی چمکنے لگیں۔

— لیکن وہ تو بہت قدیم زمانے کا شہر ہے۔

— ہوں۔ کیا میں قدیم نہیں؟

بھالو نے بیڑی کا کش لگایا اور اس کی آنکھوں نے بوڑھے کی آنکھوں کی تمام سوچ نگل لی۔

— یہ وہی شہر ہے نا، جہاں سے اس رقاصہ کا مجسمہ،

— ہاں

— لیکن وہ شہر تو معدوم ہو چکا ہے۔ ایک زمانہ ہوا۔

ہم میں سے ایک کی سوچ زبان پر آکے بھاپ ہو گئی۔ سردی ہی اتنی تھی۔ بھالو نے بیڑی کا ایک اور گہرا کش لیا۔

— نہیں، کوئی شے نہیں مٹتی۔ صرف زمانہ مٹ جاتا ہے، انسان کے اندر گھل جاتا ہے۔ انسان سارے زمانوں کا خزانہ ہے، موئنجو داڑو، رنگا متی، ہڑپہ، مینا متی۔

ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہم سب نے پہلی مرتبہ اس کی بات پر دھیان دیا تھا۔ وہ ہر وقت مسکرانے والا، بات بات پر بھالو بھالو کہنے والا، جس سے جب بھی ہمارا جی جو کچھ لینے کو چاہتا، بعض اوقات اس کی مزاحمت کے باوجود اس سے لے لیا کرتے تھے، اس کی بات سن کر بوڑھے کی آنکھیں جیسے یادوں کے خمار سے بھر آئیں۔

— وہ رقاصہ

ہم ہمہ تن گوش ہو گئے۔ بھالو بیڑی کے تیز تیز کش لینے لگا۔

—— بھالو، شوب بھالو۔ رنگا متی، رقاصہ ایک ہی بات۔ موئنجو متی۔

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہم بوڑھے کی بات سننے کے لئے بے قرار تھے۔ ہم میں سے ایک نے پھر اس کی بیڑی اس کی انگلیوں سے اڑالی، وہ چُپ ہو گیا اور ہماری طرح سوالیہ نظروں سے بوڑھے کو دیکھنے لگا۔ بے حد تجسس نظروں سے۔

—— وہ رقاصہ میری بیوی تھی۔

—— یہی تو بولا نا کہ

ہماری تیز کھا جانے والی نظروں نے بھالو کو یوں کر دیا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ اب ہم ایک بار پھر اسی طرح اپنی اپنی سوچ میں گم ہو گئے جس طرح وہ نئی نئی مونچھوں والا لڑکا شروع ہی سے بیٹھا تھا۔

—— ہمارا شہر، ہماری زندگی۔ ہم نے سوچا۔ ہماری جو مین، شونار دیش، موئنجو متی۔

جانے اس لڑکے کو کیا ہوا کہ جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی تھیں، یکلخت چیخ اٹھا۔

—— جھوٹے، تم سب جھوٹے ہو۔ ہم سب کھوئے ہوئے ہیں اور ہمارا سارا عمل بے معنی ہے تم سمجھ رہے ہو ہم یہ نہر اپنے لئے کھود رہے ہیں؟ یہ سراب ہے۔ یہ نہر ہم اپنے لئے کھود رہے ہیں نہ اس سے ہماری زندگی ہمارے لئے آگے گی۔ ورنہ ان نیلی پیلی، سبز، لال بھاگتی روشنیوں کو خواب بنا کر ہمارے گرد گاڑ نہ دیا جاتا۔ صرف یہ قید حقیقت ہے کہ ایک دوسرے کے جسموں پر سلاخیں گندہ دیکھے ہیں۔ ہم سب، نہیں ہیں۔ جھوٹے، مکار بڈھے۔ صرف یہ روشنیاں ہیں جو لاری سے باہر ہمارے جسموں پر سلاخیں بن کر بھاگتی ہیں۔

لڑکے کی آنکھوں میں خون اُبل کر جھاگ بنا۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور سوچا، کہیں یہ سچائی کا لمحہ تو نہیں جو بیتنے ہی نہیں پاتا؟ لڑکے نے اٹھ کر بوڑھے کو داڑھی سے پکڑ لیا اور اسے جھٹکے دیتا ہوا، لاری کے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔

—— حقیقت یہ ہے جو لاری کے دروازے کے سامنے رانفلیں لئے بیٹھی ہے۔ جلا دو اس حقیقت کو، کہ اس سے نئی حقیقت جنم لے۔ وہ نہر جس کے بطن سے ہم سب پیدا ہوں، تب موئنجو متی۔

—— بھالو۔ بھالو۔ بالکل

بھالو نے بیڑی کے تیز تیز کش لیتے ہوئے، فیلسوفوں کی طرح کہا اور اٹھ کر دونوں میں بیچ بچاؤ کرتا تا ان کے ساتھ لاری کے دروازے کے قریب آگیا۔

—— ارے —— رے، تم دونوں تو آپس میں دشمن نہیں، دشمن تو یہ ہیں۔

ہم بھالو کو رائفلوں والے پہرہ داروں کی طرف اشارہ کرتے دیکھ کر اور بھی حیران و پریشان ہو گئے۔ چٹانوں سے تراشے ہوئے کڑیل جوانوں سمیٹ ہم سب دم سادھے بیٹھے رہے۔

رائفلوں والے اس لڑکے کی طرف رائفلیں لئے لپکے جس کی مونچھیں نئی نئی پھوٹی تھیں اور جواب بوڑھے کو بُری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔

—— نہیں تو مجھے بتاؤ میں کون ہوں ؟ ہم سب کون ہیں ؟

—— تم میرے

اس سے پیشتر کہ بوڑھا اپنا جملہ مکمل کرتا، ایک رائفل والے نے لڑکے کے کاندھے پر رائفل کے کندے سے بھرپور وار کیا۔

—— تم اس رناسہ کے حرامی پلے ہو۔

کندا لڑکے کے کندھے سے پھسل کر اس کے جبڑے سے جا ٹکرایا تھا اور لڑکے کی زبان کو بھی زخمی کر گیا تھا۔

لڑکا لاری کے فرش پر جا گرا اور اپنی تکلیف کی شدت کو اپنے وجود میں جذب کر گیا۔ زبان کے زخم سے اس کے منہ سے سُرخ سُرخ لہو بہنے لگا تھا۔ بوڑھے کی آنکھیں پدرانہ شفقت سے بھر آئیں۔ بوڑھے کے ساتھ بھالو بھی فرش پر گرے لڑکے پر جھک گیا۔ بوڑھا اس لڑکے کا کندھا دبانے لگا۔ بھالو نے لڑکے کے منہ سے بہتے لہو کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اور ناک کی پھننگیں سکڑنے پھیلنے لگیں۔

—— ہی ہی ہی ہی ہی ہی

رائفلوں والے ہنستے ہی جا رہے تھے۔

پھر بھالو کے ہاتھوں پر لگا لڑکے کی زبان کا لہو اس کی آنکھوں میں اتر آیا اور وہ رائفل والوں

پھر پل پڑا۔

—— سو تجھ پتی نہیں جانتا شالا؟ یہ پہاڑ لہو ہے، یہ ندی ہماری ہے، یہ جوہین ہماری ہے۔ یہ جیون ہمارا ہے کہ ہم نہر کو کھودتا ہے اور اس کو اپنے پسینے سے بھرتا ہے۔

اور ہم سب، سنگلاخ چٹانوں سے تراشے ہوئے کڑیل جوان بھی اس کی جرأت پر انگلیاں منہ میں لے کر رہ گئے تھے۔

ایک زمانہ ہوا،

اگرچہ ہم اب بل ڈوزروں، کرینوں، ٹریکٹروں کے درمیان گھرے ہیں، پھر بھی سارا سارا دن مٹی کی ٹوکریاں اٹھا اٹھا کر ٹرکوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔

چپ چاپ۔

کبھی کبھار ہماری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا ہے جب ایک زمانہ پہلے لاری والے واقعے کے بعد انہوں نے بھالو کو آتنا پیٹا تھا، اتنا پیٹا تھا کہ اس کے ہاتھوں پر لگا اس لڑکے کی زبان کا لہو اس کے سارے جسم پر پھیل گیا تھا، کہیں ابلتے چشموں کی صورت اور کہیں نیل بن کر۔

پھر وہ شخص کہ جو بھالو تھا، بہت اچھا تھا، ان کے حصار کو یوں توڑ کر بھاگا تھا کہ ہم تو کیا اس کے جسم پر لہو کے نقشے بنانے والے بھی اسے یاد کرتے ہیں۔

اور وہ منظر بھی، جب ایک زمانہ پہلے اس لڑکے کو، جس کی مونچھیں نئی نئی چھوٹی تھیں، جس کی زخمی زبان سے سرخ سرخ ابلتا لہو سچائی کا ایسا لمحہ بن گیا تھا جو زبانوں پر پھیل رہا تھا، کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔

وہ آج بھی وہیں بند ہے۔

ہم قیدی نہیں ہیں۔ صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر یاد آتا ہے کہ ہم قیدی ہیں، اور یا پھر سروں پر منڈلاتے رائفلوں والے پہرہ داروں کو دیکھ کر۔

ہمارے ہونٹوں پر اب بھی چپ کی مہریں ہیں۔

ہم چھوٹے سے ٹیلے پر سستانے کے لئے بیٹھے ہیں۔

—— اٹھو، اٹھو، کام کرو۔ بھاگنے کی سوچ رہے ہو؟ سازشی!

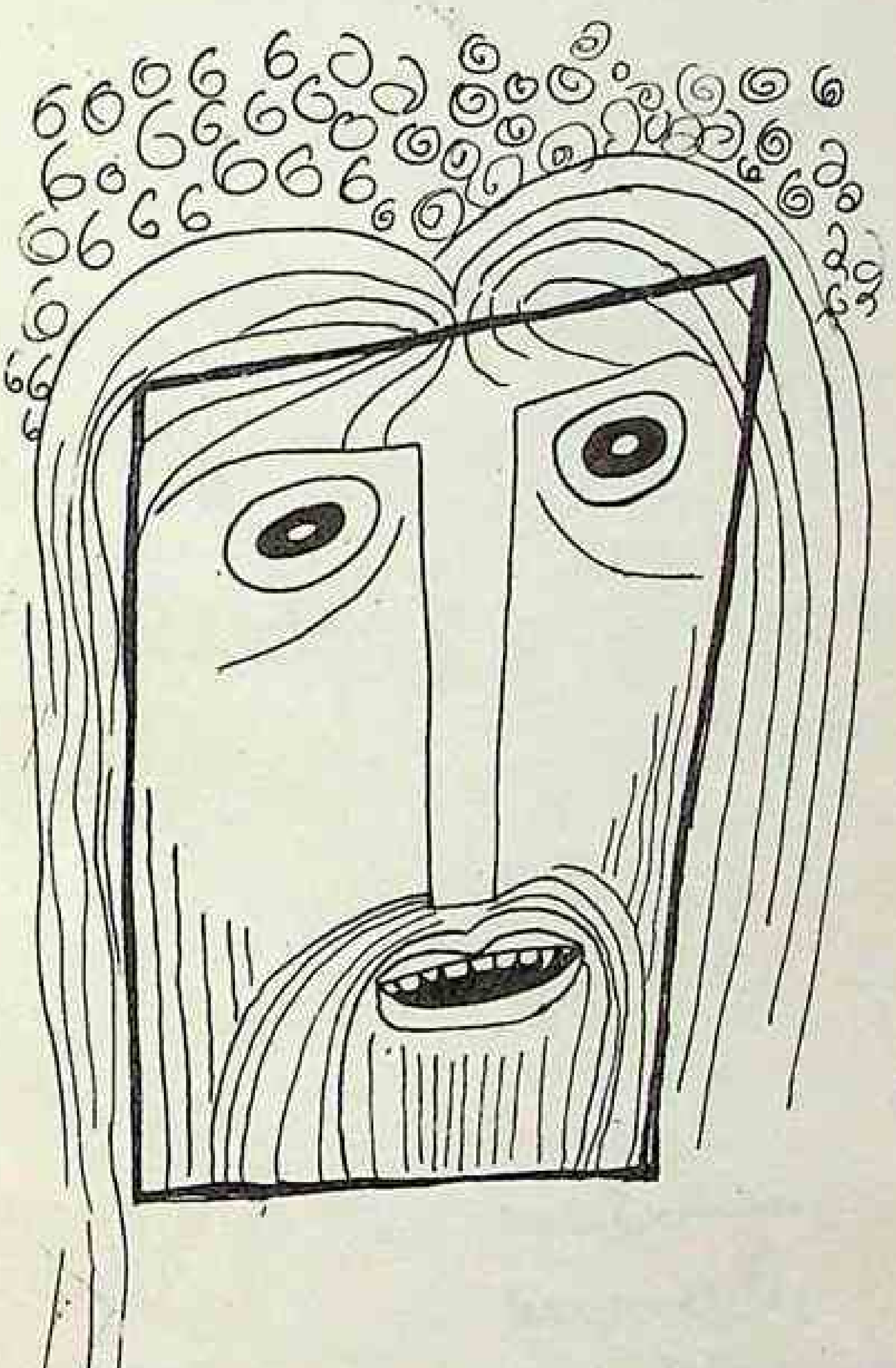
ان میں سے ایک آگے غرایا ہے۔

ہماری چپ سازش ہے!

لیکن ہم بھاگیں گے نہیں۔ یہ نہر ہماری ہے کہ جس کا بطن جب کروڑوں قطروں سے مل کر بنے دریاؤں کے پانی سے لبالب بھر جائے گا تو ہماری زمین ہمارے خون پسینے سے سیراب ہو کر ہمیں جنم دے گی، ہمیں زندگی دے گی۔

کہ اب ہم سب بھالو لوگ ہیں، بہت ہی بھالو۔

محبت کی داستان
مچھلی اور دیوتا
عجائب گھر



محبت کی داستان

آسمان کی طرف جاتی سیڑھیاں، لاتعداد سیڑھیاں، جن کے آخر میں عالیشان محل چمکتے سورج جیسا لشکتا کلچرڈ موتی ہے۔

وہ، کہ جس کے پھیپھڑے بانجھ شہر کے دھوئیں، سرطانی کھیتوں کی دھول سے ضیق النفس، جس کی زبان اور آنکھوں میں کتابوں کے چاٹے ہوئے کانٹے، وہ کہ جس کے جسم کی کھال اس کا لباس ہے، پہلی سیڑھی پر پیر رکھ کر لمحہ بھر کے لئے موتی محل سے منعکس ست رنگی کرنوں کو دیکھتا ہے۔ کرنوں کے پردے وا ہوتے ہیں۔ ایک مرمریں ہاتھ اسے بلاتا ہے۔ وہ سیڑھیوں کو دو دو چار کر کے پھلانگتا، چڑھتا چلا جاتا ہے لیکن وہ محل کی طرف بڑھتا جتنا فاصلہ طے کرتا ہے، محل، موتی کی طرح وقت کی گرفت سے پھسل کر اتنا ہی دور ہو جاتا ہے۔

وہ پسینے میں کچھ ہانپتا لرزتا، لڑکھڑاتا گرتے ہی لگتا ہے کہ ساری کائنات اس کی نظروں میں جامد ہو جاتی ہے۔ وہ تیسری سیڑھی پہ کھڑی ہے۔ مسکرا کے کہتی ہے۔

کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟

وہ چونک کر دیکھتا ہے۔

اس نے موتی کے چھلکے کا کفتان پہنا ہے۔ اس کا جسم چمکتے سورج میں یوں لشکتا ہے۔ جیسے کلچرڈ موتی۔ زمین سے برآمدے کی سطح، تیسری سیڑھی ہے جہاں وہ کھڑی ہے۔

وہ اپنی گردن میں اٹھتے درد کی لہر کو دانت بھینچ کر کچل دیتا ہے۔

کچھ نہیں۔

تو آؤ۔ سوچ کیا رہے ہو؟

پیٹ کا سارا تیزاب اس کے حلق میں آ کے اٹک جاتا ہے۔ وہ اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے

اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس کی گردن کی ہڈی میں درد کی لہر پھر اٹھتی ہے، اس مرتبہ اس کے سر پر محیط ہو جاتی ہے جسے وہ کوشش کے باوجود دانتوں میں کچل نہیں پاتا۔

دونوں اس کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں سورج کی ست رنگی کرنیں یکجا ہو کر کلچرڈ موتی کا روپ دھارتی ہیں۔

کمرے کی ہر چیز موتیوں سے بنی ہے، سفید ٹھٹھری ہوئی، اس بلی کے سوا جس کا رنگ سیاہ ہے، جس کی گردن میں موتیوں کے ہار ہیں!!

بلی سفید مخملیں صوفے پر بڑی تمکنت سے بیٹھی انہیں کمرے میں داخل ہوتا دیکھتی ہے اور بائیں مینٹل پیس پر بڑا عورت کا وہ بت جس کا کوئی رنگ نہیں، مگر اس کے جسم پر کوئی پردہ نہیں، ساتوں پردے اس کے پیروں پر پڑے ہیں، ایک ہاتھ رقص کے انداز میں ہوا کی فضا میں جامد ہو گیا ہے اور دوسرے ہاتھ نے مرد کے کٹے سر کو الجھے الجھے لمبے بالوں سے پکڑ رکھا ہے اور بڑی نخوت سے تسخر بھری مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے سر کو دیکھتی ہے۔

اس کی گردن کا درد جو ابھی چند لمحے پہلے اس کے سر کے گرد کلبوت بن گیا تھا۔ مینٹل پیس پر اس جگہ نظریں پڑتے ہی غائب ہو جاتا ہے جہاں وہ بت پڑا ہے جو اسے نظر نہیں آتا کہ اس بت کا کوئی رنگ نہیں۔

وہ لڑکی کو بے حد محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے، لڑکی آنکھوں میں اتھاہ پیار لئے مسکراتی ہے۔ وہ وارفتگی سے اس کو سینے سے لگانے کے لئے اسے بازوؤں میں لینے کے لئے بڑھتا ہے، وہ اس کی بانہوں میں آتی آتی یوں پھسل جاتی ہے جیسے وقت کی گرفت سے کلچرڈ موتی۔

صوفے پر بیٹھی سیاہ بلی بڑی تمکنت سے ایک ہلکی خرر رر کر کے پہلو بدل لیتی ہے۔

وہ ایک بار پھر پیٹ سے ابلتے تیزاب کو حلق میں دبا کے، اپنی گردن سے ابھرتے درد کو دانتوں میں کچلتا دیتا ہے اور ہانپتا لرزتا، لڑکھڑاتا کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے۔ لکھنے والی میز پر کہنیاں ٹکا کے سر ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔ لڑکی ہنستی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔

میز پر انتہائی خوبصورت کلچرڈ موتیوں کے چھلکے سے بنے کاغذ کا رائٹنگ پیڈ ہے۔ کلچرڈ موتی

ہی سے بنے، کاغذ کاٹنے کا چاقو، قلمدان جس کی دواتوں میں سرخ اور سیاہ روشنائی ہے۔ لڑکی اس کو یوں ہاتھوں میں سر کو تھامے دیکھ کر کاغذ کاٹنے والا چاقو اٹھا کے اس سے کھیلنے لگتی ہے۔

سیاہ بلی آنکھیں موند لیتی ہے۔

—— تمھیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟

وہ اسی طرح سر تھامے اس سے پوچھتا ہے۔

—— ہے۔ ہے، بہت ہے۔

—— تو، تو پھر تم، تم کیوں؟

وہ اپنے ہاتھوں کے پیالے سے سر اٹھاتا ہے۔ اس کی نظریں مرمریں ہاتھوں میں تیز دھار چاقو پر پڑتی ہیں۔ وہ ایک دم ہاتھ بڑھا کر چاقو چھین لیتا ہے۔ انگوٹھے سے چاقو کی دھار کو پرکھتا ہے اور پھر ماہر سرجن کی طرح اپنے سینے پر اس طرح چاک دیتا ہے جہاں اس کا دل ہے۔

اسی لمحے سیاہ بلی بہت احتیاط سے جیسے موتیوں کے ہاروں کو سنبھالتی صوفے سے اترتی ہے اور ان کی میز کے گرد ایک بار چکر لگا کے لڑکی کے پاس فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔

وہ سینے کے چاک کو وا کر کے خلا میں ہاتھ ڈالتا ہے اور اپنا دل نکال کر کلچرڈ موتی سے بنی میز کی سطح پر رکھ دیتا ہے۔

—— یہ لو۔

لڑکی کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے۔

سیاہ بلی وہیں لڑکی کے قدموں میں بیٹھی جیسے کسی خواب سے چونکتی ہے۔

وہ موتی کے چھلکوں سے بنے کاغذوں کے پیڈ کو لڑکی کے سامنے سرکا دیتا ہے۔ قلمدان سے قلم اٹھاتا ہے اور لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔

—— یہ تمھارے موتیوں سے بنے قلمدان کا قلم ہے اور یہ ہے میرا دل۔ موتی کے چھلکے پر اس کی تشبیہہ بناؤ۔ رنگ کا انتخاب تم پر چھوڑتا ہوں۔

لڑکی حیران پریشان، میز پر پڑے سرخ سرخ دھڑکتے دل کو غور سے دیکھتی ہے پھر کانپتے ہاتھوں سے قلم تھام کر سیاہی میں ڈبو کر موتی کے چھلکے کاغذ پر اس کے دل کی تشبیہہ بنانے لگتی ہے۔

چند لمحوں بعد کاغذ پر لڑکی کا قلم بڑی تیزی سے چلنے لگتا ہے اور اس کی زبان پیاسے جانور کی طرح منہ سے لٹکنے لگتی ہے۔ وہ اس لڑکی کے پیروں میں بیٹھی سیاہ بلی کو دیکھتا ہے، بڑے محبت بھرے لہجے میں لڑکی سے کہتا ہے۔

—— اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے بناؤ۔ میں جاؤں گا نہیں۔

جانے کتنے لمحے، کتنی صدیاں بیت جاتی ہیں۔

بالآخر لڑکی دل کی شبیہہ مکمل کر لیتی ہے۔ ہو بہو اس کا دل، لیکن سرخ کی بجائے سیاہ۔

وہ کلچرڈ موتی کے چھلکے پر بنا سیاہ دل اٹھا لیتا ہے اور اسے دل ہی کی شکل دے کر سینے کے اندر خلا میں اس جگہ رکھ لیتا ہے جہاں سے اس نے اپنا دل نکالا تھا۔

لڑکی میز کے دراز سے سٹیپلر[1] نکالتی ہے، بڑی محبت سے اس کے سینے کے چاک کے کناروں کو جوڑتی ہے اور اتنی مہارت سے سٹیپلر کی پنیں لگاتی ہے کہ زخم مندمل ہونے پر کوئی نہیں جان سکتا کہ یہاں چاک تھا۔

سٹیپلر واپس دراز میں رکھتے ہوئے اس لڑکی کی نظریں میز پر پڑے دل پر پڑتی ہیں جو جانے کتنے لمحے کتنی صدیاں اس کا ماڈل بنا رہا ہے۔ دل سے نگاہیں اٹھا کر وہ اسے سوالیہ نظروں سے پوچھتی ہے، اسے کیا کرنا ہے؟

—— اسے بلی کے لئے رہنے دو۔

تب وہ لڑکی اٹھ کر بے حد محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ وہ اس کی نگاہوں سے مسحور اٹھتا ہے۔ وہ اس کی گردن میں بازو حمائل کر دیتی ہے جہاں یوں لگتا ہے جیسے کبھی درد نہ تھا۔

وہ اسی طرح، جیسے نیند میں اس کے ساتھ چل دیتا ہے۔ وہ اسے اپنی خوابگاہ میں لے جاتی ہے جہاں نرم نرم جھاگ کا بستر حجلۂ عروسی بنا ہے۔

خوابگاہ کو جاتے ہوئے اس کی مسحور نظریں سیاہ بلی کو نہیں دیکھتیں جس نے اب تمکنت کا چولا اتار پھینکا ہے اور میز پر چڑھی، خونخوار درندے کی طرح، میز پر پڑے دل کو اپنے پنجوں میں

---

[1] STAPLER

لئے بہت بے دردی کے ساتھ اپنے تیز دانتوں سے نوچتی ہے اور نہ ہی اس کی مسحور آنکھیں اس عورت کے بت کو دیکھتی ہیں جس کے جسم کے ساتوں پردے اس کے پیروں میں پڑے ہیں جس کا ایک ہاتھ رقص کے انداز میں لہراتا فضا میں جامد ہو گیا ہے اور جس کے دوسرے ہاتھ نے مرد کے کٹے ہوئے سر کو الجھے ہوئے لمبے لمبے بالوں سے تھام رکھا ہے۔

چمکتے سورج میں کلچرڈ موتی کی طرح لشکتے عالیشان محل سے زمین کی طرف اترتی سیڑھیوں، لاتعداد سیڑھیوں کے آخر میں کروڑہا لوگوں کا ہجوم، جن کے پھیپھڑے بانجھ شہر کے دھوئیں سرطانی کھیتوں کی دھول سے ضیق النفس، جن کی زبانوں، آنکھوں اور کانوں میں کتابوں سے چاٹے گئے لفظوں کے کانٹے ہیں، جن کی کھالیں، جن کا لباس ہیں، اپنے اپنے سروں کو اپنے اپنے ہاتھوں کی طشتریوں میں اٹھائے اس کے حوالے سے اپنے نئے جنم کے منتظر ہیں کہ جس کے دھڑکتے دل کو کلچرڈ موتی محل میں سیاہ بلی کھا چکی ہے۔

مچھلی اور دیوتا

گندے جوہڑوں میں تیرتی، متعفن پانی میں اپنے جسموں سے قوسِ قزح کو اتارنے کی سعی کرتی مچھلیاں تازہ ہوا کے بند دروازے پر دستک دیتی ہیں۔

کھڑکی میں لگے کرد شیشے سے مٹنے پردوں کے پاس کھڑا ہیبت ناک مونچھوں والا شخص جس نے کرتہ اور لاچا پہن رکھا ہے اور جس کی پگڑی کا طرّہ پھن اٹھائے ہے[1] جیسے اس دستک کی آواز سن کر چونک جاتا ہے، اس جانب دیکھتا ہے جہاں رنگین پایوں والے، سرہانے کی طرف لگے جالی فریم کے درمیان آئینہ جڑے نواری پلنگ پر ایک برہنہ لڑکی بے سدھ پڑی ہے۔ اس لڑکی کا سُلفے کی لاٹ ورگا بدن پلنگ پر بکھر بکھر گیا ہے۔ اس کے جسم میں اُترتی قوسِ قزح سے ایک رنگ، صرف ایک رنگ پلنگ پر بچھی سفید ریشمی چادر کی سلوٹوں میں پھیل گیا ہے جیسے زمین کی شریانیں پھوٹ بہی ہوں۔ زمین کی مٹی اور چھپر کا پانی اس کے جسم کی شکل میں گندھ کر اس کی بند پلکوں پہ ذروں، قطروں کی صورت اٹک گیا ہے۔ اس کے چہرے، اس کے بازوؤں، اس کی چھاتیوں، اس کے پیٹ، اس کی ٹانگوں میں اجڑی فصل، چھنے ہوئے پسینے اور لٹے ہوئے خزانے کی مفلسی، مجبوری کی ننگی سسکیاں دنداسہ لگے ہونٹوں پر آکے کراہوں میں یوں بدل جاتی ہیں جیسے تازہ ہوا کے بند دروازوں پر دستک کی آواز۔

وہ شخص لڑکی کو ساکت دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس نے ایک بار پھر اپنے موٹے بھدے ہاتھوں سے سلفے کی لاٹ کو اس طور بکھیر کے بستر کی سلوٹوں میں باندھا ہے کہ چمکیلے رنگ کے،

---

[1] پگڑی کا استعمال انسان کے اس اجتماعی شعور کا حصہ ہے جب وہ ناگ دیوتا کی پرستش کرتا تھا۔ پگڑی کے بل ناگ دیوتا کی کنڈلی اور طرّہ پھن۔ جب انسان خود دیوتا بنا تو اس نے پگڑی کی صورت اپنی ناگ کی صورت کو برقرار رکھا۔

فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہنے بسنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے ہیں اور جیسے زمین کی سلوٹ سے ابھرتی کراہیں کائنات میں بھٹکتی آوازوں میں سے کوئی ایک لہر تھی جس کا کانوں سے یونہی گذر ہو گیا؟

وہ مسکراتا ہوا مڑ کے کروشیئے سے بنے پردوں کی اوٹ سے باہر جھانکنے لگتا ہے جہاں تاحدِ نگاہ فصلیں سونے کا روپ دھار چکی ہیں۔

ازل سے بار بار یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے پلنگ کے سرہانے جالی دار فریم میں جڑا آئینہ اس گڈریے کی آنکھوں ایسا ہو کر رہ گیا ہے جو فصلوں میں درندوں کی بنائی ہوئی ان گذرگاہوں کو دیکھتی ہیں جن پر اس کا ریوڑ منتشر ہو گیا ہو۔

ازل سے، جب بھی وہ یہ جان کر خزانے کی خواہش کرتے ہیں کہ سونا ان کے جسموں سے اگتا ہے تو انہیں اس مقام پر روانہ کر دیا جاتا ہے جہاں قوسِ قزح زمین کو چھوتی ہے کہ خزانہ تو در اصل وہاں دفن ہے۔ جب وہ اس خزانے کی تلاش میں نکل جاتے ہیں تو لوٹ کر نہیں آتے۔

تب نئی فصل تیار ہوتی ہے، جس کے کٹنے پر انہیں پھر اپنی خواہشوں کی تشفی کے لئے اس خزانے کی تلاش میں بھیج دیا جاتا ہے۔

پھر نئی فصل، پھر نئی فصل۔

بستر کی سلوٹوں میں سلوٹ، وہ برہنہ لڑکی جانے کب سے اس انتظار میں ہے کہ خزانے کے متلاشی اس تک پہنچیں اور اسے اس کی لاش سے آزاد کرائیں۔

وہ جب بھی ہوش میں آتی ہے، کراہتی ہے، تڑپتی ہے، تازہ ہوا کے بند دروازوں پر دستک دیتی ہے تو قوسِ قزح کو بستر کے شکنجے میں کس کر بہا دیا جاتا ہے، اسے اپنی لاش میں اتار دیا جاتا ہے۔

اب آئینہ بھی راہ تکتے پتھرا چلا ہے کہ آج تک ان متلاشیوں میں سے کوئی نہیں آیا جو قوسِ قزح کے زمین میں اترنے کو فریبِ نظر ہونے کی خبر دے اور یہ شک کرے کہ کہیں قوسِ قزح اس گھر میں اس پلنگ پر تو نہیں اترتی؟

تو پھر پہاڑوں، میدانوں، صحراؤں میں کون صور پھونکے کہ عکس آئینے سے آزاد ہو۔

تب آئینے میں پلنگ کے سرہانے مشعل جل اٹھتی ہے کہ سورج سنہرے میں سرخی بکھیرتا، نئے دن کی نوید لاتے چلا گیا ہے۔

وہ شخص کھڑکی سے باہر جھانکتا مسکراتا ہے۔ باہر سے آتی مدہم ہوا میں اس کی پگڑی کا طرہ چمن کی طرح ہولے ہولے لہراتا ہے تا حدِ نگاہ چھوٹے چھوٹے الاؤ روشن ہو جاتے ہیں کہ فصل پک کر تیار ہو چکی ہے۔

جب فصل پر پہلی درانتی چلتی ہے تو ڈھول کی تھاپ پر خونخوار مونچھوں والے کی موٹی بھدی انگلیاں آہستہ آہستہ تھرکنے لگتی ہیں۔

پھر سب ایک بہت بڑے الاؤ کے ارد گرد رقص کرنے لگتے ہیں۔

آئینے میں روشن مشعل کی روشنی بے سُدھ لڑکی سے پھسلتی اس شخص تک پہنچتی معدوم ہو جاتی ہے چند لمحوں بعد اس بے سُدھ برہنہ لڑکی کے جسم کے پٹھے ایک ایک کر کے ڈھول کی تال پہ پھڑکنے لگتے ہیں۔

الاؤ کے بھڑکتے شعلے، فصلوں پر ناچتے سائے کہ کل کو انہیں بھی خزانے کی تلاش میں جلنا ہے۔ وہ ڈھول کی اسی تال پر ناچتے ایک پُتلا تیار کرتے ہیں اور شاید جانتے ہیں کہ پُتلا اسی شخص سے ملتا جلتا ہے جو خونخوار مونچھوں کو بل دیتا گرد شیشے کے پردے کی اوٹ سے انہیں دیکھتا ہے۔

پھر ناچنے والوں میں ایک کو جانے کیا سوجھتی ہے کہ وہ دیوانہ وار رقص کرنے لگتا ہے، اسی خروش میں اس پُتلے کے سر پہ پگڑی باندھ دیتا ہے جس کا طرہ مدہم ہوا میں ناگ کے پھن کی طرح جھومنے لگتا ہے۔

عین اس وقت پلنگ کے سرہانے جالی دار فریم میں جڑے آئینے میں پہلی تریڑ پڑتی ہے، ہلکی سی، بے آواز کہ آئینے کو خود بھی پتہ نہیں چلتا۔

اس بے سُدھ برہنہ لڑکی کے جسم کے، ڈھول کی تال پر پھڑکتے پٹھے اب ڈھول کی تال کے مطابق تیزی سے پھڑکنے لگے ہیں، اور تیز، اور تیز۔

پُتلے کے سر پہ طرے دار پگڑی دیکھ کر موٹی موٹی بھدی انگلیاں کھڑکی کی دہلیز پر بجتی رک جاتی ہیں، مسکراہٹ میں پھیلے بھدے ہونٹ تحیر میں پھٹ جاتے ہیں کہ پُتلے کے سر پر چمن دار پگڑی دیکھ کر رقص لمحہ بھر کو رک گیا ہے اور اس بوجھل لمحہ بھر کے وقفے میں سب حیرت سے کبھی کھڑکی کی جانب دیکھتے ہیں اور کبھی پُتلے کو۔

تب پتلے کے سر پر پگڑی باندھنے والا جانگر مارتا آسمان کی اور دیکھتا ہے، اشارہ کرتا ہے۔
رات کی تاریکی میں سلگتی کہکشاں بھڑکتے الاؤ کی روشنی میں قوس قزح بن کر اس کھڑکی میں اترتی دکھائی دیتی ہے۔
یہ دیکھتے ہی سب مل کر پتلے کو کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں اور الاؤ کے گرد دیوانہ وار ناچنے لگتے ہیں، اس تال پر کہ جس پہ اس برہنہ بے سُدھ لڑکی کے بدن کی تھرک عروج پہ ہے اور جس تال پر وہ پہلے کبھی نہ ناچے تھے۔ وہ ناچتے ناچتے پتلے کو الاؤ میں پھینک دیتے ہیں۔ لمحہ بھر کے لئے شعلے آسمان کو چاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ کر شیشے کے پردوں سے جھانکتا خونخوار مونچھوں والا سکتے میں آ جاتا ہے۔
پھر وہ سب ناچتے کودتے ان جوہڑوں کو پھلانگتے ہیں جن میں تیرتی، متعفن پانی میں اپنے جسموں میں قوس قزح اتارنے کی سعی کرتی مچھلیاں بند ہوا کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔
وہ سب آزاد ہواؤں کی لے سے ہم آہنگ، ناچتے تھرکتے، جانگریں مارتے اس رخ کو بڑھتے ہیں جہاں قوس قزح کے تمام رنگ لئے، تازہ ہوا کے بند دروازوں پر دستک کی آواز لئے کھڑکی میں کہکشاں اتر رہی ہے کہ انہوں نے جان لیا ہے کہ ان کے خون اور پسینے کے قطرے جھنکتی اشرفیوں کی صورت دراصل وہاں دفن ہیں اور زمین اور آسمان کا اتصال محض فریب نظر ہے۔
وہ آئینہ کہ جو ازل سے راہ تکتے تکتے پتھرا چلا تھا، تڑختا ہے، ٹوٹتا ہے اور اس کے تیز دھار ٹکڑے بستر پر بکھر جاتے ہیں۔
عکس کے آزاد ہونے کی کڑک پہ پھن دار شخص انتہائی جنون میں کھڑکی سے پلٹتا ہے، وہیں ساکت ہو جاتا ہے۔
برہنہ لڑکی سرخ سرخ، چمکیلے دھبوں والی چادر سے اپنا ستر ڈھانپے، دوسرے ہاتھ سے بستر سے ٹوٹے آئینے کا سب سے بڑا، تلوار ایسا تیز دھار ٹکڑا اٹھاتی ہے اور وار کرنے کے انداز میں للکارتی پھن دار سر کی طرف خونخوار شیرنی کی طرح بپھرتی بڑھتی ہے بڑھ رہی ہے،
اور باہر چاروں اور سے گھیراؤ کرتی، کہکشاں کی لو میں دہکتی، تھرکتی، ناچتی، للکارتی درانتیاں

ہمارے ذہن میں یہ خیال آتے ہی ہمارے دل دہل جاتے ہیں اور ہم سوچتے ہیں کہ مرجھائی ہوئی سرسوں کے پھول ایسے چہرے والا کیا سوچ رہا ہے — ہم سب کہ سوئی گیس، جوہری توانائی، مصنوعی تولید، نیوروسس، کاروزی، معدے کے السروں کے خالق بھی ہیں اور مخلوق بھی، جن کے مقبرے، پرچھائیاں، چپ کی سازش ہیں اور شراب، قہقہہ کا ملسٹ، غدار جاسوسوں کی طرح روپوش ہو جانے کی کوشش میں ہیں کہ شناخت کر لئے جانے پر کوئی گولی نہ مار دے۔ ہم سب ہپ پاکٹس میں، بٹوؤں میں، اپنے اپنے شناختی کارڈ اور بھی مضبوطی سے تھام لیتے ہیں اور مسکراتی، استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں جس کا چہرہ سرسوں کا مرجھایا پھول ہے اور جس نے اپنے ٹخنگیاں لگے گاڑھے کے کرتے کی جیب میں ہوا کو شناختی کارڈ جان کر مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔

— بے شرم!

ہم میں ایک نازک سی لجاتی ہوئی آواز آتی ہے۔ سب ہنس پڑتے ہیں۔ وہ چونک اٹھتا ہے۔ ہماری طرف بڑھتا ہوا اشارہ کرتا ہے۔

— یہ — یہ کھڑکی سے بھاگ کیوں نہیں جاتا؟

— احمق۔

ہمارے حلق قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔ تب سرسوں کے پھول کی زردی رفتہ رفتہ سفید ہوتی سرخی میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔

— احمق؟

وہ بے حد معصومیت سے پوچھتا ہے۔ ہمارا خیال تھا وہ تنہا ہے۔ تب یہ سوال سن کر جانے کیوں ہم اپنی اپنی تنہائیوں کا لبادہ اوڑھ کر اس ہال میں جا نکلتے ہیں جہاں دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بے شمار آئینے ہی آئینے جڑے ہیں۔ جہاں سے منعکس، برہنہ، الف ننگا ایک ہجوم ہمارا سواگت کرتا ہے۔ اس الف ننگے ہجوم کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر، اپنے آپ کو تنہائیوں کے لبادے سے پھسلتا جان کر ہم اپنے آپ کو یوں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ہاتھوں

ہم نے محسوس نہیں کیا، وہ ہمارے ساتھ شیش محل میں آیا، یا نہیں۔

— میں ملکہ بننا پسند نہیں کروں گی۔

دبی دبی شرمیلی آواز کے ساتھ ہی کوئی، کسی ماہرِ آثارِ قدیمہ کا قول دہراتا ہے۔

— عجیب بات ہے کہ ہم حقیقتوں کی شناخت کے لئے مُردوں کی کھوپڑیوں سے مدد حاصل کرتے ہیں۔

— لیکن ہمارے پاس شناختی کارڈ ہیں۔

ہم چیختے ہیں، اپنی اپنی کھوپڑیوں میں ہر پل نئے بھڑکتے جہنم کو بجھانے کی سعی کرتے کھلی فضا کی خواہش میں باہر آجاتے ہیں۔

باہر نیم روشن، سرد تاریکی میں ہم، جیسے آوارہ۔

دور سے کولتار پر پڑتے، میخوں والے بوٹوں کی آوازیں قریب آتی ہیں۔

— آپ کے شناختی کارڈ —؟

ہم سب اپنے اپنے شناختی کارڈ پیش کرتے ہیں۔

— ٹھیک ہے، آپ جا سکتے ہیں۔ تم — تمہارا شناختی کارڈ؟

گھنگیاں لگے گاڑھے کے کرتے اور تہبند والا آنکھیں جھپکتا انہیں دیکھتا ہے۔

— کارڈ، جس سے تمہاری شناخت کی جا سکے — تمہاری تصویر؟

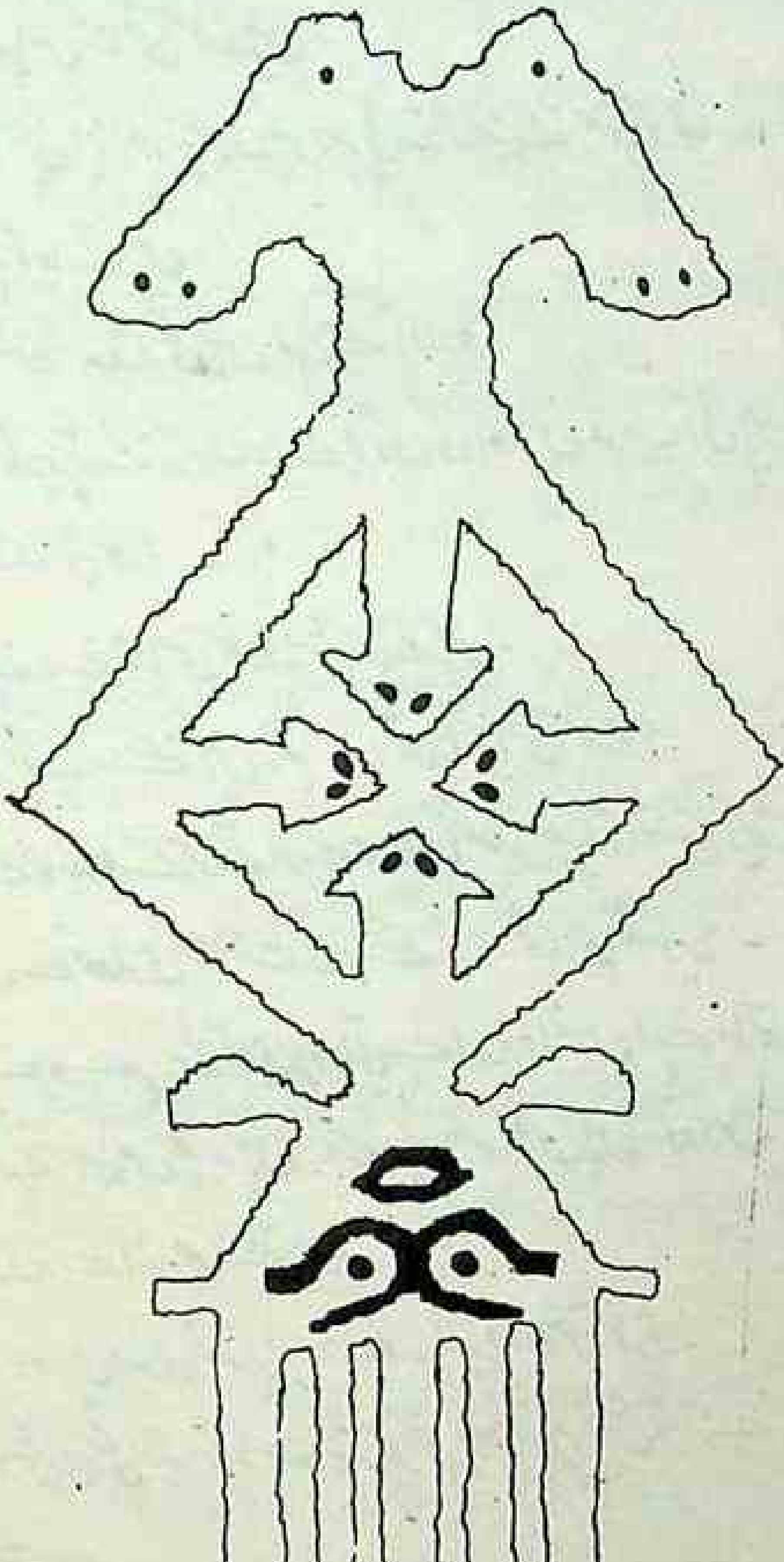
تب اس کے چہرے پر سرخی گہری ہو جاتی ہے اور وہ انہیں اپنے ساتھ اونچی اونچی دیواروں کی طرف لے جاتا ہے، جن میں چھید ہیں، روزن ہیں، دراڑیں ہیں۔ وہ اس کے کہنے پر چھیدوں، روزنوں اور دراڑوں سے اندر جھانکتے ہیں۔

— وہ — وہ رہی میری تصویر — وہ رہا میرا شناختی کارڈ۔

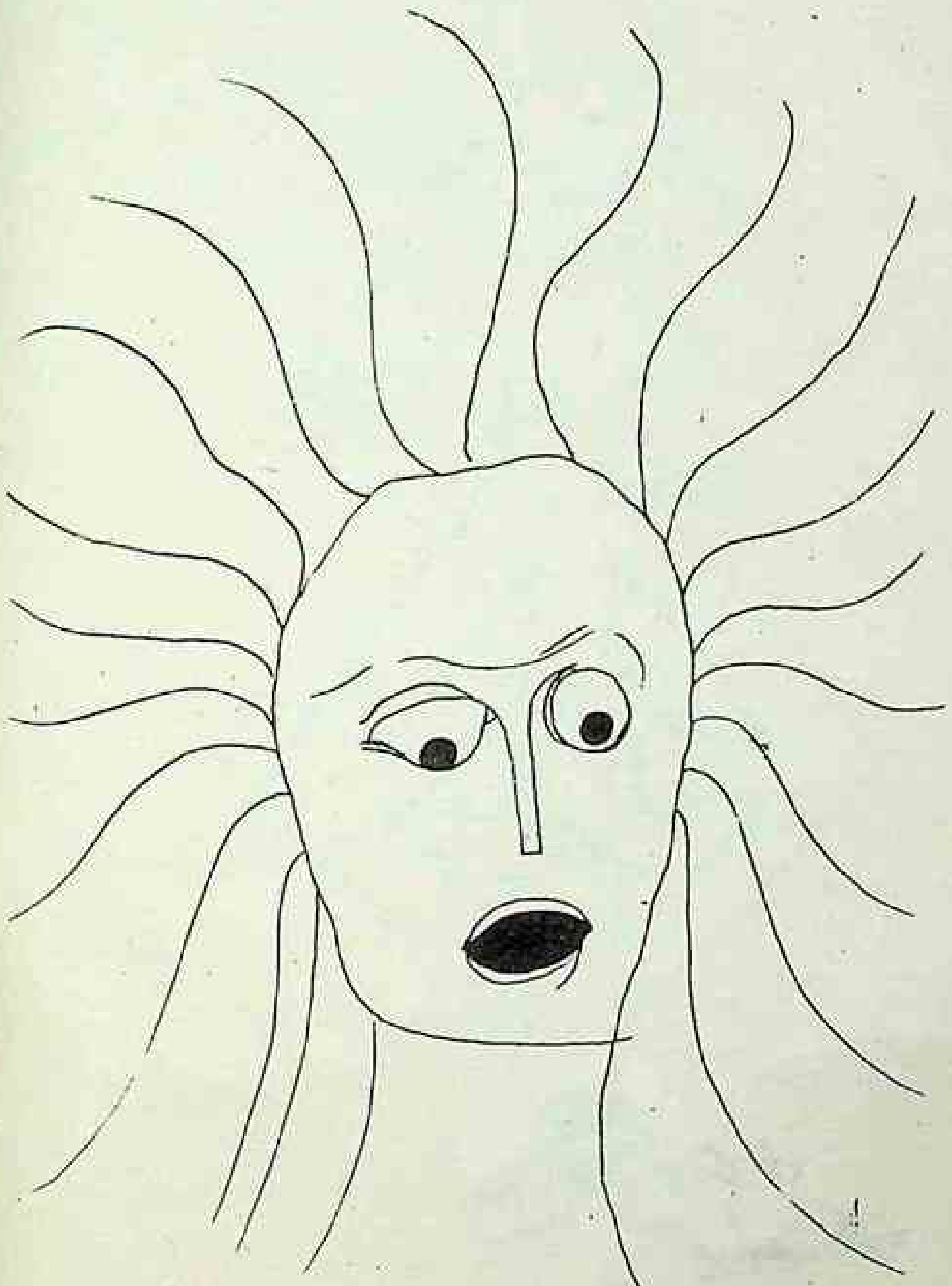
وہ سب، تاش کی ننگی ملکہ اور دست بہ زنجیر نیم برہنہ مرد پر فحش آوازے کستے، ہنستے اُسے گالیاں دیتے پلٹتے ہیں۔

— چلو تھانے۔

ہم سڑک پر پڑتے میخوں والے بوٹوں کی آوازوں میں ننگے پیروں سے ابھرتی چپ کے ڈھیروں ڈھیر پھیلتے خلا کو دیکھے بغیر ہی ایک دوسرے کو مسکرا کے دیکھتے ہوئے اپنے اپنے شناختی کارڈوں کو مضبوطی سے تھامے اپنی لیموسینوں کی طرف چل دیتے ہیں۔



تلاش
یوسف کھوہ
رات کا سفرنامہ



تلاش

تیز سرد ہوا

روشنی، وہ روشنی جو مصنوعی روشنی کے نہ ہوتے ہوئے، انتہائی اندھیروں کے باوجود سیاہ آسمانوں سے اتر کے اشیا کے بیرونی خطوط بناتی ہے۔

غلام گردشوں، راہداریوں، برآمدوں، محرابوں، بند دروازوں، کھڑکیوں کے روزنوں میں ٹن ٹناتی تیز، سرد ہوا۔

گلیوں، بازاروں، سڑکوں کو رات سونگھ گئی ہے۔ سارا شہر رات کے ڈنک کی لذت سے بے ہوش پڑا ہے۔

شہر کے تمام راستے کھدے پڑے ہیں، جیسے شہر والوں نے شہر کی تلاش میں کھود ڈالے ہیں۔

—— اسی راستے پر گم ہوا تھا۔

وہ جھکا ہوا اٹھتا ہے۔

سیاہ آسمانوں کی سرمئی روشنی میں اس کے وجود کے بیرونی خطوط لمحہ بھر کے لئے کپکپاتے ہیں۔

—— یہیں تو کھویا تھا کہیں

وہ کہیں کو اپنے گرد اور بھی لپیٹ لیتا ہے

تاریکی کی آواز بہت خوفزدہ کردیا کرتی ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں، یہ پلک جھپکتے میں وجود کے گرد گھیرا ڈال کر چمٹ جاتی ہے۔ سرد، ٹن ٹناتی ہوا کی طرح ہر شے، ہر واقعے، ہر یاد کو آنکھوں کے فریم میں منجمد کردیتی ہے۔

بکی ہوئی بحثیں، تفریحیں، ہم بستریاں، امرت کی سنسنی رگوں میں بھر آتی، وہ موت جو کل آئی تھی، وہ موت جو کل آئے گی۔

—— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

لیکن تاریکی کی یہ سرد ٹھٹھرتی ہوئی آواز چیخ کو گلے میں دبا دیتی ہے، پرندے کے حلق سے ابھرتی سیٹی جسے اس کے گرد چمٹا اپنی ہی ہوا کا گھیراؤ اسے گھونٹ دیتا ہے۔ تب یہ گھٹی گھٹی، دبی دبی چیخ اس کے چہرے کو مسخ کر دیتی ہے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ فاقہ زدہ چہرے کو دیکھنے والوں کو خوف آنے لگتا ہے۔

فاقہ زدہ خاموشی کی تاریکی اتنی ہی خوفزدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔

— یہیں، یہیں تو کھویا تھا۔

تاریکی کی یہ سرد ٹھٹھرتی آواز سیلاب کی طرح امڈتی ہے اور راستوں کو اکھاڑتی کھودتی ان میں شہروں کو دفن کرتی، پھنکار کے جھاگ میں ابل پڑتی ہے۔

— یہیں کہیں۔

وہ ہاتھ میں پکڑی ٹارچ بجھا کے جیب میں رکھ لیتا ہے، ہاتھوں میں سردی کو رگڑتا ہے۔ جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں لگا لیتا ہے۔ اس کے قریب سے ایک سایہ گزرتا ہے۔ وہ پلٹ کر اس سے پوچھتا ہے۔

— ماچس ہو گی ؟

— نہیں۔

سایہ رک جاتا ہے

سگریٹ اس کے منہ سے چھوٹ کر گر جاتا ہے اور گرم بھاپ یکدم منہ سے نکل کر سرد تاریک فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ وہ فوراً جیب سے ٹارچ نکال کر آواز کا چہرہ روشن کرتا ہے۔

— اوہ

اسے دھچکا سا لگتا ہے۔ وہ فوراً ٹارچ بجھا کر جیب میں رکھ لیتا ہے۔ جھک کر زمین سے سگریٹ اٹھاتا ہے۔ سگریٹ کو انگلیوں میں دبا کر، سامنے ہونٹوں پر لپ سٹک میں پھیلی مسکراہٹ سے منہ موڑ لیتا ہے۔ وہ سرگوشی میں کہتی ہے۔

— تم اس وقت اتنی سردی میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ اتنے اندھیرے میں ؟

— یہیں، یہیں، کہیں — یہیں کہیں — شہر۔

وہ بوکھلا جاتا ہے۔ وہ اور قریب آ کر اس کے کان میں سرگوشی کرتی ہے۔

— میرے ساتھ آؤ۔

— کیوں؟

— شاید میرے ماں مل جائے۔

— تم یہاں کیا کر رہی ہو؟

— تلاش۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ وہ گھبرا کے اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔ گشت کے سپاہی تو کیا، دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا۔ سارا شہر رات کے ڈنک کی لذت سے مدہوش پڑا ہے۔

— تم کیا تلاش کر رہی ہو؟

— ماچس۔

— جس میں آگ اور روشنی دونوں بند ہوتے ہیں نا۔ آؤ میرے ساتھ۔

وہ جیب میں سگریٹ رکھتا دم بخود ہو جاتا ہے۔ تاریکی میں ٹرن ٹرناتی سرد ہوا ایک چیخ کر اس کے گلے میں دبا کر اس کے چہرے کو مسخ کر دیتی ہے جیسے پرندے کے حلق سے ابھرتی سیٹی جسے اس کے گرد محیط اپنا ہی ہوا کا سمندر اسے وہیں گھونٹ دیتا ہے۔

— آؤ، تمہیں پتہ نہیں میں کیسی ہوں۔

— سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ مجھے پتا ہے۔ بھوکی، فاقہ زدہ چہرہ جس پر میک اپ کا ماسک۔

— تم غلط سمجھے میں ان میں سے نہیں۔

— تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟

— تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ کھوئے کھوئے، گم گم، گونگے گونگے سے۔ میری طرح۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے متلاشی! نہیں؟ ہوں؟

وہ اس کی طرف دیکھتا ہے، اس تاریک روشنی میں جو سیاہ آسمانوں سے اتر آتی ہے۔ کھدے ہوئے راستوں کے کنارے کھڑے دونوں کے بیرونی خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔ سرد ٹرن ٹرناتی تیز ہوا، کھدے ہوئے راستوں کی خاک بن کر اس کے مساموں میں سرایت

کرجاتی ہے۔

— آؤ نا۔ میں اور تم ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے لئے تلاش کریں گے۔ آگ ماچس میں بند ہوتی ہے اور روشنی بھی؟ نہیں نہیں۔ جھجکتے کیوں ہو؟ میں معاوضہ نہیں لوں گی۔ اگر ہم نے ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے لئے پالیا تو کیا یہی معاوضہ نہیں ہوگا۔

لمحہ بھر کا سکوت جس میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔

— میں، میں تمہیں چھو کر دیکھ سکتا ہوں؟

— نہیں، نہیں، ابھی نہیں۔

وہ مسکراتی ہے۔ اس کے لپ سٹک میں ملفوف ہونٹوں پر مسکراہٹ، زخم سے ابھرتے لہو کی طرح پھیل کر جم جاتی ہے، جو اسے نظر نہیں آتی۔

وہ اس لڑکی کی باتوں کی بھول بھلیاں میں گھومتا گھامتا اس کے ساتھ گھر آجاتا ہے۔ دروازے کا کھڑاک سن کر کسی کمرے سے نحیف سی، لرزتی، سرورات کی ڈوبی بوڑھی آواز آتی ہے۔

— آگئی ہو؟

— ہاں، ہاں۔

وہ بجلی کا سوئچ دباتی ہے۔ بجلی کی رو کبھی کم کبھی زیادہ، بلب جگنو کی پشت، سرد، ٹمٹماتا ہوا۔ وہ پلٹ کر فوراً دروازہ بند کرتی ہے لیکن تاریک، سرد، تیز سن سناتی ہوا، کھردرے راستوں کی کرچیوں کو کمرے کے ایک ایک مسام میں بھر جاتی ہے۔

وہ اپنا قمیص اتار پھینکتا ہے۔

وہ برقع اتار کے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہے۔ اس کے سرخ ہونٹوں پر مسکراہٹ ایک بار پھر زخم سے ابھرتے لہو کی طرح پھیل کر جم جاتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں بکھری کتابوں کو چاٹتی اس کی حیرت زدہ آنکھوں میں ویرانے پھیلتے دیکھتی ہے وہ یکدم تیزی سے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر جما لہو چوس لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے اور گالوں کے گڑھے اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لڑکی ذرا خوفزدہ ہو جاتی ہے۔ فاقہ زدہ خاموشی کی تاریکی اتنی خوفزدہ کر دینے والی ہوتی ہے۔ ہونٹ، چہرے، لہو، بارود، جسم، منہ پھاڑے زخم، ہاتھ لاتعداد ہاتھ جن میں شین گنیں،

رائفلیں، ہینڈ گرنیڈ، چیونٹیوں کی طرح دوڑتے ٹینک۔

— موت۔

وہ کتابوں پر جمی نظروں کو آنکھوں کو پوری قوت سے چیخ کر کھینچ لیتا ہے۔ اس کی چیخ کو سرسراتی ہواؤں میں جھومتے سمندر بنوں، دھان کے لہلہاتے کھیتوں، گھاٹیوں پر جھومتی چلئے کی پتیوں اور گہرے پانیوں میں مچلتی مچھلیوں کے گیتوں سے گونجتے سائیکلون اس کے حلق میں دبا دیتے ہیں جیسے پرندے کے حلق سے ابھرتی سیٹی کو اس کے گرد محیط اپناہی ہوا کا سمندر اسے وہیں گھونٹ دیتا ہے۔

— نہیں زندگی۔

وہ اپنے کمرے میں بکھری کتابوں پر اچٹتی نظر ڈال کر بڑے پیار سے سرگوشی میں کہتی ہے۔ اب وہ بستر میں گھس چکی ہے۔ اس نے لحاف کو اپنی گردن تک کھینچ لیا ہے۔ اس کے دانت کٹکٹاتے ہیں۔

— آجاؤ، سردی بہت زیادہ ہے۔ ٹھٹھر جاؤ گے۔

وہ اسے دیکھتا، پلکیں جھپکاتا اپنے پیٹ کو تھامتا ہے جس میں گذرے ہوئے کل اور آنے والے کل کی مجتیں، تفریحیں، فلسفے، تاریخ، جغرافیے، معاشیات، سیاسیات، آزادیاں، غلامیاں چیخ بن کر سینے میں پھیلی جل گمڑی میں پھنسی پھڑپھڑاتی ہیں۔

چیخ کا حلق میں دبا دیا جانا بہت بڑا عذاب ہے۔

اس عذاب سے نجات پانے کے لئے وہ پھر جیب سے سگریٹ نکال لیتا ہے۔ کتابوں سے نظریں چراتا ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ وہ اسے مشورہ دیتی ہے۔

— سگریٹ بعد میں، اور کتاب بھی۔

اگر یہ تلملاتی، تڑپتی، پھڑپھڑاتی چیخ خود کو جل گمڑی سے آزاد کرالے تو ریل گاڑیاں پٹریوں سے اتر جائیں گی، بسیں، کاریں، رکشے، انسان بے قابو ہو کر آپس میں ٹکرا جائیں گے نئی کنواری نابالغ چیخ، پرانی بوسیدہ کائنات میں معلق صحیفوں پر ٹمٹماتے ستاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصادم کردے گی، کہ جس سے نئے صحیفوں، نئے ستاروں، نئے انسان، نئے فلسفے، نئی تاریخ،

نئی کائنات کے جنم کے امکانات روشن ہوں؟ کہ جس کا جغرافیہ کوئی نہ ہو؟

— کیوں نہیں؟

وہ خود سے کہتا ہے

— کیا؟ کیا کہا؟

— تلاش۔

وہ یکدم دروازہ کھول دیتا ہے۔

سرد، تیز، تڑ تڑاتی ہوا اس کے سینے پر وار کرتی ہے۔ وہ اپنے مساموں کو کھدے ہوئے راستوں کی کرچیوں سے بچانے کے لئے تیزی سے پلٹ کر فرش سے اپنا کھیس اٹھا کر اوڑھ لیتا ہے۔

— رک جاؤ۔

لڑکی بھرائی آواز میں کہتی ہے۔ بستر میں نیم دراز، نیم برہنہ لڑکی کی آنکھوں کے گرد حلقے اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔ گالوں کے گڑھے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہونٹوں پر جمی لہو کی پیڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔

فاقہ زدہ خاموشی اتنی ہی خوفزدہ کرنے والی ہوتی ہے۔

وہ کچھ کہنے کی خواہش میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آتا ہے۔

دور حد نگاہ تمام راستے کھدے پڑے ہیں جیسے شہر والوں نے شہر کی تلاش میں کھود ڈالے ہیں۔

— یہیں تو کھویا تھا کہیں۔

وہ ہونٹوں کے درمیان اٹکے ان جلے سگریٹ کو مٹھی میں پکڑ کر مسل دیتا ہے۔ جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کرتا ہے اور پھر سے تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے سرد بستر میں تاریک رات کو گلے سے لگائے، نیم دراز، نیم برہنہ، اپنے پیٹ میں فاقوں کو تھپکتی، چھاتیوں میں نامکمل محبتوں کو سہلاتی، اپنے کمرے میں بکھری کتابوں کے تمام لفظ آنکھوں میں سمیٹ کر سہانے خوابوں کی آرزو میں آنکھیں موند لیتی ہے۔

سہانے خوابوں کی آرزو ہمیشہ کی طرح آنکھیں موندتے ہی پلکوں میں جھلملانے لگتی ہے۔

یوسف کھوہ

جنگل، بیابان، تپتی ریت، جلتی دوپہر، دور پانی کا کنواں اور مست سی، ہیجان انگیز، دیوانہ کر دینے والی —— گگوگو ——

لمحہ بعد لمحہ، سال بعد سال، تیز سانسوں کی لالچی، عورتوں کو شُسن یخ مردوں کو جنگلی بنا دیتی ہے، گگوگو۔ ہوائی جہاز، ریل انجن، فیکٹریاں، ورکشاپیں، بسیں، رکشے، عورتیں، بلیاں، بچے منہ اٹھا کر پکارتے ہیں۔

—— یوسف کھوہ

جب ہم سڑکوں پر تنہا ہوتے ہیں، جب ٹھنڈی بھیگی راتیں ایک ایک آواز کو سمیٹنے کی کوشش کرتی ہیں تو جنگل، بیابان، تپتی ریت، جلتی دوپہر، پانی سے لبالب کنوئیں پھیل جاتے ہیں اور گگوگو کا سیلاب اُمڈ آتا ہے اور ہمیں لے کر ڈوبنے لگتا ہے۔

گگوگو، دل کی دھڑکن، ہمارا پیچھا کرتی ہے۔

ہم بھاگتے ہیں

یوسف کھوہ

ہم بھاگ نہیں پاتے، زمین پاؤں پڑ جاتی ہے۔ اپنی تمام خواہشوں سمیت تنہا، کہاں جائیں —— ہم، اتنے تنہا، جیسے یوسف کھوہ، گگوگو۔ تنہائی کی یہ آواز، عجیب آواز ہے۔ دغا کی واردات کا اعلان، بلند آواز میں غداری کا انکشاف، صدا بہ صحرا کہ ہم میں سے کون جانتا ہے، ٹیئر گیس سے پھٹتے ہوئے پھیپھڑوں کی آواز کا ردیف قافیہ کیا ہے۔ خوف و ہراس میں بھاگتے، انسانی بستا مپیڈ میں کچلے ہوئے بچوں کے آخری سانسوں، تار تار کپڑوں سے جھانکتی

چھاتیوں، جبر سے سوچتی کوکھوں کا آہنگ کیا ہے۔ چارج لاٹھیوں اور سنسناتی گولیوں سے ابھرتی چیخوں کا تعلق شعر کی کس صنف سے ہے؟ آؤ، چلیں اپنے گھروں کو اور اپنے بانجھ خوابوں کی سوچی کوکھ سے تعبیروں کے جنم کی سعی کریں اور چپ رہیں کہ آہنگ، ردیفیں، قافیے تنگ ہو گئے ہیں۔ صرف فاختہ اس تنہائی، اس عذاب، اس احساس کو لفظ دینا جانتی ہے، اعلان کی جرأت، یوسف کھوہ، یوسف کھوہ۔

یہ پگڈنڈی، جس پر ہم تنہا ہوتے ہیں، ہماری ہے۔ اوپر چاندنی سے ٹھنڈا آسمان، نیچے دھوپ سے گرم دھول، نغمے سناتی ہوا، زمین کی باس لیے بارش، یہ پگڈنڈی جس پر ہم تنہا ہوتے ہیں، ہماری ہے۔ ہم نے اپنا دل ہار دیا۔ اپنی معصومیت، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، عزیز رشتہ دار، اپنا گھر، اپنی جنگ، اپنا آدھا ملک ہار دیا لیکن یہ پگڈنڈی —— ! یہ پگڈنڈی ہماری ہے جہاں جنگلوں، بیابانوں، جلتی دوپہروں، تپتی ریت اور پانی کے کنوؤں سے چھنکتی چھنکاتی ایک صدا آ کر ہمارے گرد محیط ہو جاتی ہے۔ ہمارے گرد۔ ہم کہ کٹیلے آنسوؤں، بیروا نہ انداز سے جذباتی ایک اور والہانہ عشق سے فریب خوردہ، تنہا، مغرور راستے، کھوئے ہوئے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ، شہر شہر بھول بھلیوں میں بھٹکائے ہوئے۔

فاختہ کی زاری، ان بھول بھلیاں میں کھوئے ہوؤں کی تلاش میں نکل آتی ہے تو کبھی کبھی، کبھی کبھار جب مست ہاتھی کی طرح دوڑتی بس کی روشن بتیاں گنی رات کی ناگ دیکی کہ جھنجھوڑ کر پھر اسی لحہ میں اتار جاتی ہیں تو کبھی کبھی، شہر میں ایک کھڑکی کھلی رہ جاتی ہے۔ روشنی روشن، شہوانی سانسوں کی طرح گرم گرم، کھلے پٹ، دعوتِ عمل دیتی مستطیل، رات کی انجلا میں ایک کھڑکی تب واقعات بڑی تیزی سے رونما ہونے لگتے ہیں جیسے یہ معمول ہو۔

صرف یہ تصویر۔ روشن، گرم شہوانی سانس، کھلے پٹ، کھڑکی کے فریم میں عورت اور سرد رات۔ یہ تصویر آنکھوں میں یوں اترتی ہے جیسے چرس کا پہلا کش، کنوارے پھیپھڑوں میں سرعت سے تلخ، کٹیلا، حقیقی۔ باقی سب بکواس کہ زندگی اس لمحے ایسی ہی نظر آتی ہے —— کھڑکی، عورت، سرد رات، ٹوٹی پھوٹی میز پر پڑے بوسیدہ، میلے کچیلے میز پوش پر پڑا میلا کچیلا کرسٹی کا

یوسف کھوہ، گگو گو ـــــ چھاتیاں، لہو، چرس کا کش، آگ، روشنی، جیسے سورج حلق سے اتر گیا ہے۔ آج رات یہی کافی ہے۔ کھڑکی، پنڈلیاں، رانیں، پستان، لہو اور یوسف کھوہ فاختہ کی چونچ باندھ دو، پھولوں کی خوشبو میں رچی رات کو ٹھونگے مارتی ہے۔

وہ شخص رات کی خوشبو کا ڈسا ہوا، سارا زہر اپنے وجود میں لئے اس کھڑکی سے درامت کر یوں دیکھ رہا ہے جیسے باہر پھیلی ہوئی سرد رات۔ عورت کھڑکی سے باہر جھانکتی ہے۔ زرد چہرے ویران آنکھوں اور سیاہ بالوں والی عورت۔ خوب صورت پنڈلیوں، مرمریں رانوں والی عورت۔ وہ شخص خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا سوچتا ہے، شاید اس عورت کی ٹانگیں سوؤر کی بند بوتلیں ہوں۔ اس عورت کا انداز بالکل ایسا ہے جیسے گئی رات میں کھڑکیوں میں کھڑی ہونے والی عورتوں کا ہوتا ہے، بے جھجک، ہیجان انگیز جیسے یوسف کھوہ، یوسف کھوہ۔

کھڑکی کے قریب کھڑا تنہائی کا زخم خوردہ شخص اپنے پرانے خشک جوتوں کی طرح چرمراتا ہے۔

ـــــ نہیں؟

ـــــ نہیں۔ میرے بوڑھے ماں باپ ہماری آواز سن کر جاگ جائیں گے۔ روٹی روٹی کریں گے ـــــ دوبارہ نہیں سوئیں گے۔ ساری رات ـــــ سمجھے ـــــ؟

ـــــ میرے پاس پکی پکائی تازہ روٹی ہے۔

وہ اپنی بغل سے سیلوفین پیکٹ نکال کر دکھاتا ہے۔ عورت اس پیکٹ کو غور سے دیکھتی ہے۔ کھڑکی سے پلٹتی ہے۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلتا ہے۔ سرد رات اس شخص کو سرد ہاتھوں سے تاریک کنوئیں میں دھکیل دیتی ہے۔ عورت دروازہ بند کرتی ہے۔ وہ عورت کے پیچھے دہلیز سے ٹھوکر کھاتا، کواڑ سے الجھتا، چند سیکنڈ بعد ایک روشن کمرے میں داخل ہوتا ہے، جس کی روشنی سڑک کی طرف کھلتی کھڑکی سے باہر نکلتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔ عورت بڑھ کر کھڑکی بند کرتی ہے۔ پلٹ کر عجیب نگاہوں سے اس کو دیکھتی ہے۔ اس شخص کی نگاہیں عورت کی آنکھوں کے شکنجے سے تڑپ کر نکلتی ہیں اور دیواروں پر لڑکھڑاتے لگتی ہیں۔ ننگی، میلی، جگہ جگہ سے اکھڑے پلستر والی دیواروں پر خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی تصویروں والے صدیوں پرانے دو کیلنڈر، قدیم کتبے اور ٹوٹے ہوئے شیشے، فریم میں بڑا بوسیدہ مخمل کا ٹکڑا جس پر

بجھتے سنہری تاروں سے "عمل سے زندگی بنتی ہے" والا شعر پڑھا ہے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی میز پر پڑے بوسیدہ میلے کچیلے میز پوش پر پکی پکائی روٹی کا پیکیٹ رکھ دیتا ہے۔ عورت تیزی سے بڑھ کر پیکیٹ اٹھاتی ہے اور ساتھ والے کمرے کی تاریکی کچھ ایسے روشن ہو جاتی ہے جیسے یوسف کھوہ۔ اس سمے تاریکی میں اترتی عورت اور روشنی میں اترے اس شخص کو دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا، کون روشنی میں تاریک ہوا، اور کون تاریکی میں روشن!

یوں صدیوں سے ———

رات کا سفر نامہ

تخت کی چوتھی ٹانگ اینٹیں رکھ کر بنائی گئی ہے۔

یوں لگتا ہے جیسے تین ٹانگ کے تخت پر بیٹھی عورت سانس نہیں لے رہی۔ وہ باہر کی طرف کھلتی اس ٹوٹی پھوٹی کھڑکی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے، جہاں کھڑے، باہر دیکھتے مرد کا سینہ کچھ یوں پھیل سکڑ، پھیل سکڑ رہا ہے، جیسے روشنی، تاریکی، روشنی، تاریکی میں پھیلتی سکڑتی، پھیلتی سکڑتی آنکھوں کی پتلیاں۔

کھڑکی سے باہر شہر

شہر پر تنے گدلے آسمان میں چاند، جس کی سڑاند ساری کائنات میں پھیلی ہے۔ چاند اتنا پُھسا ہوا دکھائی دیتا ہے، اتنا مدقوق کہ یقین سا ہونے لگتا ہے یہ تعفن اسی کے سانس سے ہے۔ دراصل یہ تعفن شہر میں پھیلی بدروؤں کے جال میں پھڑپھڑاتی، مکانوں سے رہائی کی امید میں بند کواڑوں پر دستک دیتی خواہشوں سے اٹھتا ہے، کاروں، بسوں، رکشوں کے ایگزاسٹ پائپوں سے نکلتا دھواں، گٹروں کے کھلے دہانوں سے اٹھتا بھپارہ، ڈرائنگ روموں میں شوں شوں سپرے سے معلق خوشبو، تنگ و تاریک گلیوں کی سیلن، پیلے سبز پتوں، گلی سڑی سبزی پھلوں کی سڑاند، تازہ پھولوں کی مہک، صابن سے ناآشنا بغلوں، چڈوں، جسم کی سلوٹوں سے اُمڈتے خشک ہوتے پسینے کی باس، اوڈی کلون، ایرینیا، ڈر، خوف، محبت، نفرت، دغا، بے تحاشی

شہر پہ پھیلی رات کی کچی کچی لوان ہی سے ترتیب پاتی ہے۔

عورت، جو تین ٹانگوں والے تخت پر، کہ چوتھی ٹانگ جس کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے، بیٹھی، مرد کی اور ٹکٹکی لگائے دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھیں خشک ہیں، پلک جھپکائے بغیر مسلسل دیکھنے کے باوجود آنکھوں میں پانی کا ایک قطرہ نہیں، اور یوں لگتا ہے جیسے وہ

سانس نہیں لے رہی۔ اس کے دوپٹے میں اتنے چھید ہیں کہ دوپٹہ خواہشوں کا جال معلوم ہوتا ہے جس میں لپٹی پیشانی، پھنسی پھنسائی، مرد کے وجود کے پار، کھڑکی سے باہر اُگے سیمنٹ کے جنگل کو دیکھتی ہے۔ روشنی، تاریکی، روشنی، تاریکی میں مرد کی آنکھوں کی پتلیاں، پھیپھڑوں کی طرح پھیلتی سکڑتی، پھیلتی سکڑتی ہیں۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کے شہر کو اس کے بسے ہوئے چاند اور متعفن رات سمیت مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔ اس کی آواز سکوت کو آری کی طرح کاٹتی ہے۔

ہم شہر ہیں ۔۔ میری جان! موٹروں، سائیکلوں، رکشوں کے ٹائر، سبزیوں پھلوں کے چھلکے، ردی کاغذ، مٹی پتھر، گلیاں، بازار، شاہراہیں، گھر گھروندے، بجلی کے کھمبے، روشنی والے روشنی سے عاری بلب، ہم شہر ہیں۔ ضیق النفس، جلتے ہوئے، ٹھٹھرتے ہوئے، ہم تنہا، یہ شہر ہیں۔ ہم شہر میں ہیں، شہر سے باہر ہیں، شہر ہمارے اندر ہے اور ہم نے پیٹ سے نہ اترتے ہوئے منحنیوں والے دجالوں سمیت سب کچھ برداشت کر رکھا ہے۔ ہم تصور میں نہ آنے والی ان پرچھائیوں کو بھی برداشت کرتے ہیں جو صرف رات میں زندہ ہوتی ہیں جو موت کی تاریکی کی باہوں میں باہیں ڈالے ویران اندھیری سڑکوں پر پھرتی ہیں اور جنہیں ایک سو سات، ایک سو نو میں گرفتار کرنے والے تاریک پلوں کے نیچے بیٹھے خود اپنی رانوں میں ہاتھ دیئے تار تار ریشم لباسوں اور ٹھکتی چھاتیوں کو سیتے ہیں، ہم ان تاریک راتوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے پہاڑ کی چڑھتے ہیں، چوٹی پر پہنچ کر پتھر رات لڑھکتی ہے، ہم اس کے پیچھے بھاگتے پہاڑی سے اترتے ہیں، پھر اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر لاد کے پہاڑی چڑھنے لگتے ہیں۔ اترتے نشے ایسی رات، خون آلود منہوں کے چھاپے خانے سے نکلتے اخبار کے کاغذوں پر پھیلی ہوئی، اعصاب پر سوار رات کو ہم برداشت کرتے ہیں اور زندہ رہ کر آج کے زمانے میں معجزے کا مظہر بن جاتے ہیں ۔۔ محبت، راتوں میں رتی محبت، اذیت ناک، ہم ہر اس شے سے محبت کرتے ہیں جو ہمارے پاس ہے۔ ڈر، خوف، کپکپی، یاس جس سے کوئی فرار نہیں، رات کے خلاؤں کو پُر کرتی ہے، ہمارے بستروں کے آس پاس، گیتوں میں، گنج گلیوں میں، لیکن ہم ہنستے ہیں۔ ہم فریب خوردہ، تلخ علوم کے وارث اور محبتوں کے ترک کئے ہوئے، ہم ہر رات سورج کو ڈھونڈتے ہیں اور صبح کب

ہو گی' اے میرے —" ہر جھوٹ کے ساتھ ہم سچ کے منتظر' رات کو کھائی ہوئی ہر قسم پر ایمان لاتے ہیں' ہم کہ جو موت کے منجدھار میں زندگی پر یقین رکھتے ہیں' ان چیزوں کے' ان آنکھوں' کانوں ناکوں کے سیلاب میں گھرے ہیں' فرار کا کوئی راستہ نہیں' ہمارے ہونٹوں سے ہنسی اُگلتی ہے' سحر میں ہمارا ایمان ہے' ہمارے اعتماد کی بنیادوں میں سحر کی روشنی ہے' ہم چیختے ہیں' کل کو پکارتے ہیں — سناٹا' سحر کی شناخت کیا ہے؟ وہ' وہ' وہ شہر' روشنی' عورتیں' تلیاں ٹمٹماتے' رات - میری جان بند کواڑ اکھاڑ پھینکو' چیخو' قسم کھاؤ' گالی دو' سسکیاں بھرو' لیکن نکلو باہر نکلو اپنے آپ سے' ہر اس شے سے جو تمہیں جلاتی ہے' اذیت دیتی ہے' اپنی اذیت کو چیخ کے ساتھ باندھ کر کھڑکی سے باہر پھینک دو - جواب ملے نہ ملے' شناخت ہو نہ ہو -

کھڑکی سے باہر شہر

کھڑکی سے باہر گلیوں میں رات' اپنے دامن میں کنواری لڑکیوں' عصمت باختہ عورتوں کی مہک لئے -

شہر کی گلیوں میں یہ گھر جس کے ایک کمرے میں کہ جس کی دیواروں کو مکڑی کے جالوں نے ایک دوسرے سے نتھی کیا ہے' مرد کھڑکی میں سے بازو باہر نکالے' شہر' اس کے ہنستے ہوئے چاند اور متعفن رات کو مٹھیوں میں لئے کھڑا ہے - وہ رات اور شہر کی بھول بھلیوں میں اس قدر کھو گیا ہے کہ اس عورت کی نظروں کے تاگے بھی اس کے لئے راستہ نہیں بن پا رہے جو تین ٹانگوں والے تخت پر بیٹھی ٹکٹکی لگائے اس کی طرف' اس سے پار مکانوں کے جنگل کو دیکھ رہی ہے اور جس کے گرد لپٹے دوپٹے میں اتنے چھید ہیں کہ خواہشوں کا جال معلوم ہوتا ہے - مرد کی آواز پھر سکوت کو چھوڑتی ہے -

تو پھر ہم زندہ کیوں ہیں نفرتوں کے حوالے سے؟ یہ نفرت ہی ہے کہ میں ہنستا ہوں - کھاتا ہوں' سوتا ہوں پھر جاگ اٹھتا ہوں — نفرتوں کے حوالے سے بچوں کی تخلیق میں لڑکیوں کے بطن میں جھوٹی محبت پھونکتا ہوں اور انہیں حقیقت کی پہچان کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہوں' حقیقت' وہ بے خون' لٹکتی سوکھی چھاتیوں' چپٹی رانوں والی کریہہ المنظر بے حد استعمال شدہ فاحشہ -

وہ عورت جسے دیکھ کر محسوس نہیں ہوتا کہ سانس لے رہی ہے اور جو تین پایوں والے

تخت پر کہ چوتھی ٹانگ جس کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے، بیٹھی ٹکر ٹکر مرد کو دیکھے جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اٹھتی ہے جیسے خواب ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی مرد کی طرف بڑھتی ہے۔ چیتھڑوں سے بنا دوپٹہ اس کے وجود سے پھسل کر زمین پر یوں پھیل جاتا ہے جیسے خواہشوں کا جال۔ وہ مرد کے بالکل پیچھے جاکر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے نازک ہونٹ ہلتے ہیں۔

—— اب کیا ہوگا؟ امکان کیا ہے؟ کب ہوگا؟

مرد مٹھیاں کھول کر کھڑکی کو دونوں طرف سے ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔

—— ہوں —— ؟ پتہ نہیں، صبح کب ہوگی —— ؟ ہم ہڈیاں چچوڑتے اور غاروں میں رہتے ہیں لیکن کسی روز بھی کچھ ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے، صبح اگلے موڑ پر ہو۔ ہو سکتا ہے اس وقت کسی بستر میں صبح جنم لے رہی ہو۔ ہو سکتا ہے جنم ہو گیا ہو کہیں جس کی شناخت ہم نہیں کر پائے۔ آج کل، پرسوں کبھی راز پالیں، اس کی شناخت کر لیں، جب ہم جاں بلب ہوں —— ؟ کہیں ہم بے حس تو نہیں؟ کہ ہم نے اپنے آپ کو قہقہوں کے حوالے کر رکھا ہے؟ پیاس، آنسوؤں اور رات کے ہراس کے حوالے کر رکھا ہے —— ؟ کیا ہم خود ہی تو اپنا جواب نہیں؟ کیا ہم خود اپنے اگلے جواب وہ نہیں؟ کیا سوال کا جواب حاصل کرنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں کہ جواب ہم نے خود ہی دینا ہے۔ بولو، بتاؤ، تم ہی کہو۔

وہ پلٹ کر قریب کھڑی عورت کی طرف دیکھتا ہے۔ تب اس عورت کی آنکھیں جو پلک جھپکے بغیر مسلسل دیکھنے کے باوجود خشک تھیں، یکدم بھر آتی ہیں۔ لیکن اس کے معصوم چہرے پر کوئی تاثرات نہیں ہیں۔ مرد کے تیز تیز بھاری سانسوں میں اس کے چھوٹے چھوٹے سانس یوں گھل مل جاتے ہیں، جیسے روشنی تاریکی، روشنی تاریکی میں پھیلتی سکڑتی پھیلتی سکڑتی آنکھوں کی پتلیوں میں سامنے نظر آنے والی چیزیں۔

دونوں لمحہ بھر کے لئے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

دیواروں کو آپس میں نتھی کرنے کرنے والی لکڑی کے جالے، تار بہ تار روشن ہونے لگتے ہیں۔ باہر چاند، ستارے، روشنی کے بلب اور بھی زرد، پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

باہر شہر ہے۔ دھندلایا ہوا، تاریک تاریک، خوفزدہ کرنے والا، تاحد نگاہ پھیلا ہوا، ظالم،

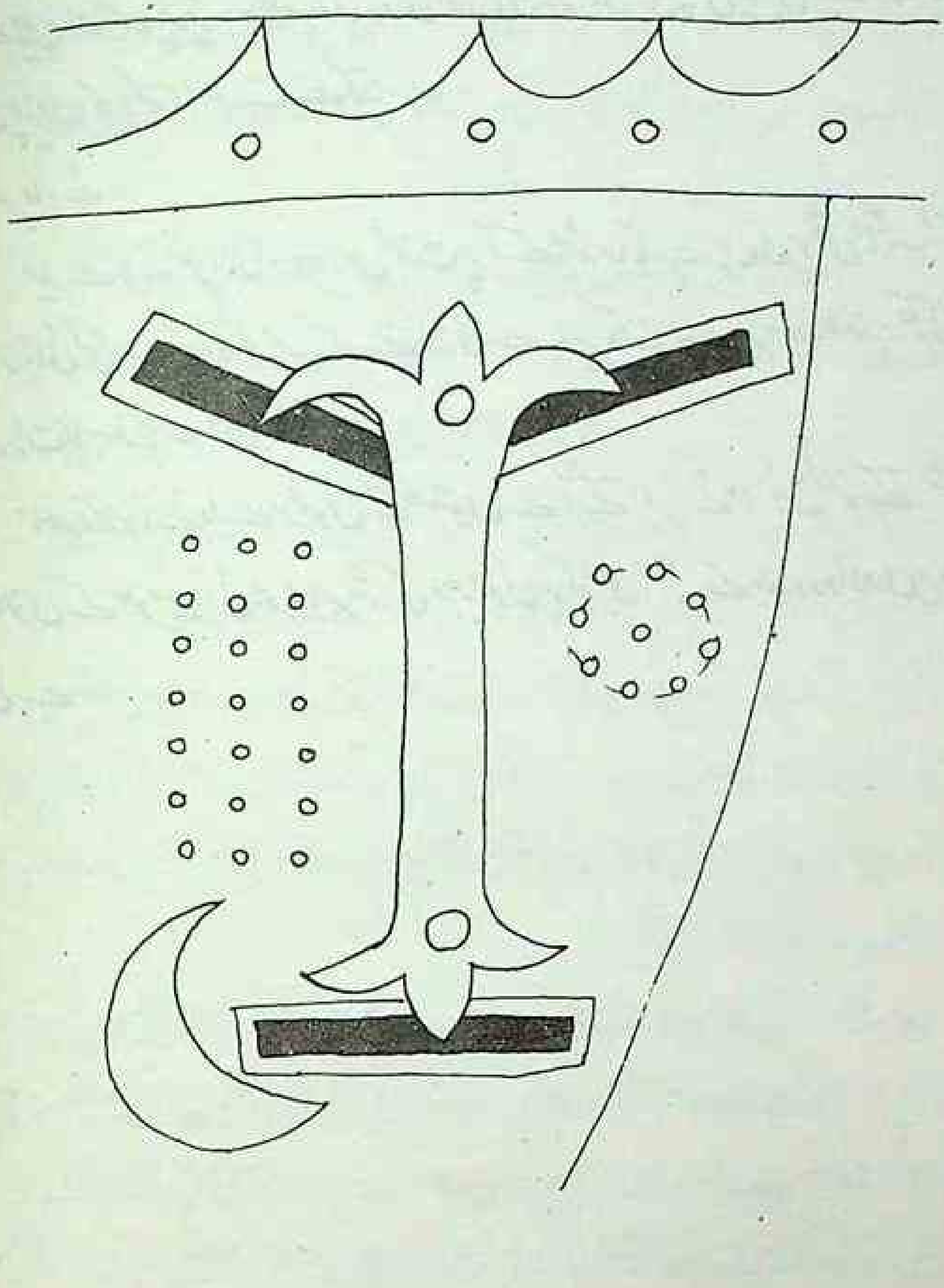
مہربان شہر ـــــ گونگا، پروقار، نہ مرنے والا[۱]
مرد، عورت کی کمر میں بازو حمائل کرکے ٹوٹی پھوٹی میز تک آتا ہے جس پر کاغذ اور قلم پڑے ہیں اور جس پر پڑے لیمپ کی روشنی اور بھی زرد، اور بھی پھیکی پڑ چکی ہے۔ وہ میز پر پڑی چیزوں کو دیکھتا، عورت سے کہتا ہے۔

ـــــ جائیے۔

میز سے کاغذ قلم اٹھا کر وہ اس تخت پر آکے بیٹھ جاتا ہے جس کی چوتھی ٹانگ اینٹیں رکھ کر بنائی گئی ہے۔ وہ لمحہ بھر کے لئے کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے پھر سفید کاغذ پر قلم کی روشنائی سے رات کا سفرنامہ لکھنے لگتا ہے۔

تا حدِ نگاہ آنے والے موسموں کے کھیتوں سے اگتے، لہراتے، اٹھتے، کڑکتے، لشکتے طوفانوں کے جلو میں آئی سحر، باہر شہر کی دہلیزوں پہ کھڑی، شہر کے بند دروازوں پر دستک دیتی ہے۔

۱؎ وولف گانگ بورشرٹ



پی ایل — ۴۸۰

یوریکا، یوریکا

حاجیمے کیجیما اور میں



پی' ایل — ۴۸۰

پی ایل فورایٹی بہت ہی عجیب مرکب ہے۔

— یہ مکھی کہاں سے آگئی ؟

یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ تجربہ، منصوبہ ناکام ہوگیا ہے۔

وہ مکھی مار اٹھاتا ہے۔ اس کی نظریں فضا میں ابھرتی، غائب ہوتی ہوئی مکھی کا تعاقب کرتی ہیں۔

لوگوں کو اجتماعی صورت میں دیکھنے پر ردِ عمل وہی ہوتا ہے جس کی توقع ہے۔ اپنے پیٹ میں پی ایل فورایٹی کی نفی، بھوک لئے غصے میں تمتماتے سرخ چہروں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ان کی طرف پھیلتا ہے جو چند لمحے پہلے خود کو زمینوں اور ان پر پھیلے آسمان کے خدا تھے کہ ان کی دانست میں ان کی انگلی کے اشارے پر سورج نکلتا تھا اور کونپل پھوٹتی تھی۔

وہ پھیلتے سمندر کے سامنے سمٹتے ہیں۔ زرد رو، لرزتے کانپتے، بازاروں، گلیوں، دکانوں، مکانوں کے کونوں کھدروں میں جہاں سے انہیں بڑی مشکل کے ساتھ تسلی دے کر نکالا جاتا ہے یہ محض فریبِ نظر ہے۔ یہ تو مرکب کے نشے میں سرخی میں انہوں نے ساری کائنات کو سرخ دیکھا ہے۔ سب او۔ کے ہے۔

ان میں سے ہر ایک پر رعشہ طاری ہے، منہ سے کف جاری۔ فوراً انہیں پی ایل فورایٹی کی ایک خوراک دی جاتی ہے۔ چند سیکنڈ بعد ان کے اعصاب پُرسکون ہو جاتے ہیں جس کے بعد ان میں مکمل کایا کلپ نوٹ کی جاتی ہے۔

— یہ مکھی کہاں گئی ؟ وہ مکھی مار میز پر رکھ دیتا ہے۔

اس مرکب کو پوری طرح استعمال کر کے اس کی خصوصیات مزید دریافت کرنی چاہئیں ایسے

کئی کیس ریکارڈ میں موجود ہیں جو خود کو دیکھتے ہیں تو اپنے آپ کو انسان جانتے تھے، لیکن یوں اجتماعی طور پر ان کا ایک دوسرے کو انسان نہ جاننا یقیناً سائنسی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے یہ جب ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو حشرات الارض نظر آتے ہیں۔

وہ آئی مکھی۔ چائے کے ساتھ ہی۔ جانے کہاں چھپی تھی اب تک ؛ وہ پھر مکھی مار اٹھا لیتا ہے لیکن مکھی شکردان پر نہیں بیٹھتی۔ ہاتھوں میں مکھی مار لئے اس کی نگاہیں مکھی کے تعاقب میں ہی گھومتی رہتی ہیں۔

—— گڈ۔ ویری گڈ۔ ونڈرفل۔

اس کی نظریں مکھی سے ہٹ کر پھر رپورٹ پر جا پڑتی ہیں۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ مکھی مار کو میز پر رکھ دیتا ہے۔

کیڑے مکوڑے، کالے کالے، خاکی خاکی، بے ضرر۔ ان میں سے انسانی خاصیت یعنی خود کو انسان منوانے کی جرأت، طاقت یعنی کمینگی کا مکمل اخراج ہو گیا ہے۔ انہیں کوئی شرم، کوئی دکھ، کوئی پچھتاوا نہیں۔ زخموں کے درد، جلن، خارش سے بلبلا کر سر اٹھانے سے عاری۔ یعنی کمینگی مکمل طور پر کاہ۔ انسانی حقوق یعنی زر، زن اور زمین میں ان کی ہوس بدستور قائم ہے، جو یہ اپنے ہم جنسوں سے بچھوں نے ہمارے عظیم مرکب کی نفی کی ہے، اپنی اشتہا کو بجھاتے ہیں۔ آزاد چھپاٹوں اور آسمانوں کی وسعتوں، بلندیوں میں اڑنے کے حقوق، غیر انسانی، منہا۔ یعنی اس کمینی خواہش کا بھی مکمل اخراج ہو گیا ہے۔ یہ تو جیسے HAM ایکٹروں کے لئے نخنے کے طور پر استعمال ہونے والی PROPS ہیں، جن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ پرفارمنس کے دوران اپنے ہاتھوں کو کیا کریں تو وہ سگریٹ نکال کے سلگا لیتا ہے اور کھیل کے دوران اپنے ہاتھوں کو یوں مصروف رکھتا ہے۔

—— اوہ گاڈ! مکھی اس کے کان پر بیٹھتے ہی اڑ جاتی۔ اس کے کان اپنی ہی بے کار چپت سے بج جاتے ہیں۔

—— ہوں۔ آگے کیا لکھا ہے ؟

جو بھی حشرات الارض کی اس مخلوقات کے ذریعے سائنسی دنیا کو اس مرکب کے نئے اثرات

سے متعارف کرائے گا۔ اس کے سینے پر تمغے سجیں گے۔ نوبل پرائز اس کا ہوگا، سائنس کا نہیں تو امن کا۔ نوواردوں کا ردِ عمل اس لیے بھی نوٹ کیا جاتا ہے کہ یہ صورتِ حال کے گواہ ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات نوٹ کی جاتی ہیں۔ ارض کے ان حشرات کی تکمیل کے بعد ایک اور کھیپ، ایک اور کھیپ۔

—— مکھی آئی۔ پھر آئی۔ لیکن اس مرتبہ وہ اسے ایک نظر دیکھ کر نظرانداز کر دیتا ہے۔

ان میں سمندر کی لہریں، آسمان کی نیلاہٹیں، تھرتھراہٹ بن کر نہیں اتر سکتیں۔ فضاؤں میں ان کی آوازوں کے پرچم پھڑپھڑا نہیں سکتے۔ غصے میں تمتماتے سرخ چہروں سے ابلتے لفظوں کے لاوے، بپھرتے سانس۔ ان کے لیے ان حقیقتوں کے کوئی معانی نہیں کہ یہ ان کے احاطۂ شناخت سے باہر ہو چکے ہیں۔ جب یہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر پھیلتا ہے تو یہ بس سمٹ جاتے ہیں، بازاروں، گلیوں، مکانوں، دکانوں کے کونوں کھدروں میں۔ اس سمندر کے سامنے مرکب کے بند باندھے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ سمندروں کو دریاؤں میں ملانے کا کوئی طریقہ دریافت کیا جائے، تب یہ حشرات الارض اس قابل ہو سکتے ہیں کہ دریا کی سطح پر اترے سمندروں کو ڈی کمپوز کر دیں۔ فی الحال تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے یہ کالے کالے، خاکی خاکی کیڑے ہیں جو اپنے جسموں کو ایک دوسرے کے جسموں کو چاٹ کر اس کی لذت میں مدہوش ہو جاتے ہیں۔ پیدائش ہی پر رینگتے ہیں، چار سو اسی تہوں میں کہ نیچے چار سو اکاسیویں تہہ ابدی سکون کی تہہ ہے، موت کی تہہ ہے، صرف ایک تہہ نیچے۔ ڈی کمپوزیشن۔ تعفن، سڑاند، کیڑے۔

حشرات الارض، لاروے، مکھیاں۔

بھیں بھیں، مکھی کے پروں کی بھنبھناہٹ، چار سُو، غسل خانے میں، الماری میں، قلم کے اوپر، دوات کے اندر، باورچی خانے میں، محبوب کے ہونٹوں پر مکھی، سنڈاس خانوں میں، گھوڑے کی پیٹھ کے زخم پر، لانبی سیاہ لیموسین کے اوپر، اس کے اندر، ہیلو ہیلو، پی ایل فور ایٹی ہم اس لیموسین کی سیر کا اعلان کرتے ہیں جس سے کیلشیم اور فاسفورس کی بُو آتی ہے۔ کیلشیم اور فاسفورس کا مرکب، ڈھانچہ، ہڈیاں، جس کی سانس کی نالی تو گل سڑ کے فنا ہو چکی ہے لیکن کارخانوں کے اخراج یا پولن کے زہریلے ذرات اور کھیتوں میں پھیلتی پولن جو ابھی تک متعفن نہیں ہوتی، اپنی گردن کی ہڈیوں کی سنگلی پر ڈیموکلیس کی تلوار کی طرح لٹکتے ہیں۔ کھوپڑی کی آنکھوں کے گڑھے اس کنگ سائز

سگریٹ پر گڑے ہیں جس پر اب مکھی بیٹھ چکی ہے۔ کنگ سائز ان آنکھوں کے گڑھوں پر وار کرتا ہے، آنکھیں کنگ سائز پر جھپٹتی ہیں۔ مکھی کنگ سائز کی ناک میں گھسنے کے لیئے پر تولتی ہی ہے کہ وہ ہاتھ سے مکھی مار میز پر رکھ کر شکر دان میز پر الٹ دیتا ہے۔ مکھی کنگ سائز اور ڈھانچے کی کشمکش سے لاتعلق شکر پر لپکتی ہے۔

مکھی اپنی رفتار کی اسیر شکر کو محض چاٹتی، اسی رفتار میں باہر نکل جاتی ہے اور ان حشرات الارض میں شامل ہو جاتی ہے جن کے رویوں کے مظاہر کے نوٹس لینے کے لئے کنگ سائز نے اپنے نائب کو بھیجا تھا، جو خود ان کالے کالے خاکی خاکی بے ضرر حشرات الارض میں شامل ہے جو اپنے جسموں کو ایک دوسرے کے جسموں کو چاٹنے، لذت آشنا ہوتے ہیں۔

پی ایل نورایٹی ایسا ہی عجیب مرکب ہے۔

کہ جس کی نفی کی بھوک پیٹ میں سمیٹے، غصے میں تمتماتے چہرے جب سرخ ہو جاتے ہیں تو اندھیری زمینوں سے تاریک آسمانوں پر طلوع ہو جاتے ہیں۔

یوریکا، یوریکا

خود کو ہوا کی لہروں پر متوازن کرتی، شیشے کی بند کھڑکی کی جھیتوں سے داخل ہوتی، مدہم مدہم آوازیں، دھات سے بنی، آہنی، جیسے گرم لوہے کو ہتھوڑے سے کوٹا جا رہا ہے، جیسے آخری شکل اختیار کرنے کے بعد لوہے سے لوہا ٹکرا رہا ہے، جیسے لوہے سے بنے تیز دھار آلے آہنی دیواروں، آہنی جسموں پر وار کر رہے ہیں۔ دور دور سے آتی خود کو ہوا کی لہروں پر متوازن کرتی آوازیں شیشے کی بند کھڑکیوں کی جھیتوں سے داخل ہو کر آہستہ آہستہ کمرے کے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوتی ہیں۔

اس کے جسم کا رُواں رُواں ان آوازوں سے لرزنے لگتا ہے۔ وہ ہاتھ میں تھامے سیاہ کاغذ کے لمبے شیٹ سے نظریں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ کمرے میں رینگتی، رگ و پے میں سرایت کرتی ان مدہم مدہم آوازوں کو نظروں سے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دائیں دیوار پر ایک دوسرے کے ساتھ لگی، آباؤ اجداد کی قدآدم تصاویر، ایک تصویر فرش پر دیوار کے سہارے الٹی پڑی ہے۔ پچھلی دیوار میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک بنی شیشے کی کھڑکی۔ بائیں دیوار میں ایک دروازہ جو دوسرے کمروں میں کھلتا ہے۔ درلی دیوار کے ساتھ بہت بڑی ساگوان سے بنی میز، جس پر سیاہ کمخواب کا میز پوش بچھا ہے، جس پر بند، کھلی، ادھ کھلی فائلوں کے انبار کے علاوہ، وسط سے ہٹ کر کنارے سے ذرا ورے ہلکی دھات کا بہت بڑا گلوب، جس کے سمندروں کا رنگ سیاہ، زمین اور حروف کا رنگ گہرا سرمئی ہے۔ میز کے نیچے ایک ٹیپ ریکارڈر جس پر ریلیں چڑھی ہیں، میز کے نیچے تاریکی کے باعث نظر نہیں آتا۔ میز کے سامنے سپرنگوں والی ساگوان کی کرسی، سیاہ کمخواب کی سیٹ اور پشت، اس کے ساتھ پینتالیس درجے کے زاویے کچھ اس انداز سے پڑا ساگوان کا پلنگ گلوب

ہے پائنتی والے پرلے کونے تک لکیر کھینچی جائے تو پلنگ کو وسط میں کاٹتی ہے۔ اس پلنگ کی چادریں تکیے سیاہ کمخواب کے ہیں۔

سرہانے پر کھسکتی اس کی گردن بالآخر اس کی آنکھوں کو دائیں طرف ساگوان سے بنی تپائی پر پڑے عمومی سائز کے چراغ پر لے آتی ہیں۔ دوسری طرف کی تپائی پر کچھ نہیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں چراغ کی سیدھی لمبی کاٹ سے سکڑ جاتی ہیں جس کی روشنی چھوٹے سے دائرے میں پھیلتی چند فٹ کے فاصلے پر تاریکی میں رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہے کہ کمرے کی تینوں دیواریں سیاہ ہیں، تمام فرنیچر سیاہ، فرش پر سیاہ قالین اور چھت، فرش کا عکس۔

اسے خود کو ہوا کی لہروں پر متوازن کرتی، دور سے آتی شیشے کی بند کھڑکی کی جھیتوں، کھڑکی پر پڑے سیاہ کمخواب کے پردوں کی اوٹ سے داخل ہوتی آہنی آوازیں نظر نہیں آتیں۔ لوہے کے تیز آلوں کی آہنی دیواروں، آہنی جسموں سے ٹکرا کر نکلنے والی آوازیں اس کے جسم کے روئیں روئیں میں لرزتی تشنج بن کر اس کے تمام وجود میں زلزلہ لے آتی ہیں۔ اس کے بری طرح کانپتے ہاتھوں سے سیاہ کاغذ کا لمبا شیٹ، جو ابھی ابھی ٹیلی پرنٹر سے اتارا گیا تھا، چھوٹ کر فرش پر جا گرتا ہے۔ وہ چیختا ہے۔

—— غلام۔

جواب نہ پا کر وہ اپنی بے حس ٹانگوں پر مکّے برسانے لگتا ہے۔ اس کی نظریں پلنگ کی پٹی پر پڑی چھڑی پر جا پڑتی ہیں۔ وہ چھڑی کو دستے سے پکڑ کر اٹھاتا ہے اور دوسرے سرے پر چڑھی نکیلی شام کو سیاہ لمبے کاغذ کے شیٹ میں گاڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن تشنج میں تڑپتے ہاتھوں کی وجہ سے اس کی یہ کارروائی ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ گردن گھما کر پھر کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ سیاہ کھڑکی میں لگے سیاہ اندھے شیشوں کے سامنے سیاہ کمخواب کا پردہ ہے۔ آہنی آوازیں، قطرہ قطرہ، جھیتوں سے ٹپکتی ہیں اور ٹپکتے ہی پٹرول کی بو کی طرح غائب ہو جاتی ہیں۔

—— غلام، غلام، غلام۔

بے حس ٹانگوں کے علاوہ اس کے بدن کا سارا تشنج عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن [illegible]

ہیں۔ وہ پھر چھڑی اٹھاتا ہے اور زور زور سے فرش پر پڑے سیاہ قالین کے اس حصے کو زدوکوب کرنے لگتا ہے، جس کے نیچے فرش میں آہنی الماری گڑی ہے۔ اس سیفٹی لاکر کی گہرائی چار فٹ، چوڑائی تین فٹ اور لمبائی چھ فٹ ہے۔ 3×6 کا ایک لکڑی کا تختہ فرش کی سطح کو ہموار رکھتا ہے۔ اس پر بچھا دیوار سے دیوار تک سیاہ قالین ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی کو پتا نہیں کہ قالین کے نیچے اس حصے میں اس کی میراث دفن ہے۔ سیاہ دیواروں سے جھانکتی آباؤ اجداد کی سیاہ تصویروں کی پتھریلی نظریں چراغ کی روشنی کے محدود دائرے سے باہر ہی پتھرا کے گر پڑتی ہیں۔ وہ قالین پہ وار کرتا، اچانک، ساتھ میز پر پڑے گلوب پہ وار کرنے لگتا ہے۔

سیاہ کھڑکیوں کی جھیتوں سے ہوا کی لہروں کے ساتھ داخل ہوتی، آہنی آوازوں کی خوشبو ذرا تیز ہو جاتی ہے تو اس کی ناک کی پھننگیں پھڑکنے لگتی ہیں، پسینے کی بُو، لوہے کی بُو، گندم کی بُو، گریس کی بُو۔

—— غلام، غلام، غلام۔

ایک شخص ایک ہاتھ میں روشن چراغ اور دوسرے ہاتھ میں سلگتی اگربتیاں لیے داخل ہوتا ہے۔

—— کہاں مر گئے تھے تم۔ بُو، تم دیکھتے نہیں۔ آوازیں۔

وہ چھڑی ہوا میں اٹھائے غور سے غلام کو دیکھتا ہے، جو مسکراتا ہوا پلنگ کی دوسری طرف تپائی پر چراغ رکھ کے کرسی کی سیاہ کمخواب کی سیٹ میں سلگتی اگربتیاں گاڑنے لگتا ہے۔

—— ادھر آؤ، غلام۔

غلام حکم کی تعمیل میں اس کے قریب جاتا ہے۔ آقا اس کے گھٹنوں پر چھڑی کا بھرپور وار کرتا ہے۔ اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہے جس پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں۔

—— ٹیلی پرنٹر، ٹیلی پرنٹر —— نیا کاغذ۔

خوب، غلام مسکراتا ہے، تو اب اس کو اپنے ہاتھوں پر قابو نہیں رہا!

وہ زمین پر پھیلے ہوئے سیاہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر آقا کو دیتا ہے، جسے پکڑے بغیر

آقا چیخ مارتا ہے، غلام پیچھے ہٹ کر جھٹکے سے پیپر پھینک دیتا ہے، ہنستا ہے

— بڑے معصوم ہو بڈھو — کیا میرے قلم کے ہاتھ سے وار تو نہیں ہوتے میں تو عالم ہوں کہ تمھیں قلم سے کہ جان قیمتی قلم سے تم ہو — دیکھو۔

وہ چیخ مار کر غلام مارنے کو ڈب کی طرف بڑھتا ہے۔ غلام ڈب کو دیکھتا ہے جس میں کے بہت سارے چیپ پڑ گئے ہیں۔ ایک تالا گلوب کا بجھ کر وہ آقا کو دیکھتا ہے اور آقا کو ڈھانک کے ساتھ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔

— میرے آبا و اجداد غلام پرور تھے، میں بھی غلام نواز ہوں — دیکھو کتنی محبت بھری شناکش کی نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

غلام کے جاتے ہی یکدم اسے چیر کھڑکی کی جھریوں سے داخل ہوتی ہوئی آہنی آوازیں، گندم پیسنے گھریں اور آہنی بو کا احساس ہوتا ہے۔ وہ چلاتا ہے۔

— غلام

غلام اخباری کاغذ کا رول بازوؤں میں اٹھائے داخل ہوتا ہے۔

— ادھر آؤ، تم اتنے سنگدل کیوں ہو رہے ہو؟ میری بات نہیں سنتے۔

غلام، اخباری کاغذ کا رول فرش پر رکھ کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس مرتبہ آقا کی چھڑی کا وار اس کے پیٹ پر پڑتا ہے، لیکن اس کا چہرہ اس مرتبہ بھی جذبات سے عاری رہتا ہے

— مرنے والے میں اتنی طاقت خدا معلوم کہاں سے آجاتی ہے؟

— نہیں، ابھی نہیں — تمھارا اور میرا معاہدہ ہے کہ — تم نے میرے ساتھ کیا ہوا ہر معاہدہ توڑا ہے — تم نے کہا تھا کہ آہنی آوازیں — یہ بدبو بدبو —

— فرض کیا، آپ مرنے سے انکار کر دیں تو —؟

غلام اخباری کاغذ کا رول کھول کر میز والی دیوار کی لمبائی کے مطابق پھاڑتا ہے۔ میز کی دراز سے سکاچ ٹیپ نکالتا ہے اور کاغذ کو دیوار پر چپکانے لگتا ہے۔ گفتگو کے دوران وہ دیوار کو اخباری کاغذ سے ڈھانپنے کا عمل جاری رکھتا ہے۔

— نہیں — میں اپنے لفظ پر قائم ہوں — خود غرض، سنگدل، منافق۔

— میں نے آپ کی غلامی میں رہ کر آپ کی تمام خصوصیات اپنانے کی کوشش کی ہے۔

— اور خدا کی قسم جب میں مروں گا تو تم میں زندہ رہ جاؤں گا۔

— شٹ!

غلام اپنی شہادت کی انگلی کو اپنے ہونٹوں پر رکھ کر باہر نکل جاتا ہے۔

— میں کتنی پرسکون سی پرامن زندگی بسر کر رہا تھا۔ تم میرے قاتل ہو — لیکن لیکن میں نے تمہیں اپنے قتل کی اجازت دے دی کہیں — مجھے گولی سے مرنے سے بہت خوف آتا ہے — خدا کے لئے — یہ آوازیں، یہ بو — وہ تشنج میں چلاتا ہے — غلام، اب ان آوازوں کی کیا ضرورت ہے، اس بدبو کی کیا ضرورت ہے — غلام جلدی آؤ —

غلام ایک گلاس میں پانی لیے داخل ہوتا ہے۔

— حفظِ ماتقدم، میرے آقا — پر آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟

— جب میں نے مرنا قبول کر لیا ہے تو پھر — تم مجھے تنہا چھوڑ جاتے ہو تو یہ آوازیں، یہ بو —

— آپ کے اور میرے باہمی تعاون سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے — یہ آوازیں، یہ بو اس وقت تک آتی رہے گی، جب تک آپ —

وہ مسکرا کے پانی کا گلاس میز پر رکھ کر جیب سے شیشی نکالتا ہے اور سیاہ سیّال مادے کے تقریباً پچیس قطرے اس میں ٹپکاتا ہے۔

— نہیں۔

آقا چیختا ہے، جیسے اس کے جسم کو گرفت میں لیتا تشنج، اس کی چیخ سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جائے گا۔

— نہیں، ابھی نہیں، ابھی تو آپ کو سکون کی ضرورت ہے۔

غلام گلاس کو آقا کے ہونٹوں کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ دائیں بائیں رکھی تپائیوں پر پڑے چراغوں کی روشنی مدہم ہو جاتی ہے۔ غلام خالی گلاس میز پر رکھ کر سرہانے کی طرف جاتا ہے اور باری باری چراغوں کی بتی اونچی کرتا ہے۔ کرسی کی سیٹ میں گڑی، سلگتی اگربتیوں کے پہلے

اینچ کی راکھ سیاہ کمخواب پر گرتی ہے۔ غلام سفید اخباری کاغذ سے سیاہ دیواروں کو ڈھانپنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ آغا خود کو تشنج کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔

— یہ، یہ تم کیا کر رہے ہو؟

— آپ کی سیاہی کو چھپا رہا ہوں۔

— میرے — میرے آباؤ اجداد کی تصویروں کو نہ ڈھانپو۔

— میں اس سفید کاغذ پر اپنے ہاتھوں سے تقدیر رقم کروں گا۔

اس مرتبہ بند کھڑکی پر آہنی آوازوں اور لو کا دباؤ ذرا بڑھ جاتا ہے کہ لوہے کے تیز دھار آلوں کے آہنی دیواروں، آہنی جسموں پر وار کرنے کی آوازیں، پسینے، گندم اور گریس کی بو، کھڑکی کی جھیتوں سے یوں نکلتی ہے جیسے بندوق کی نالی سے گولی۔

— غلام، بند کرو، یہ آوازیں — معاہدہ شکن۔

آقا اپنے دونوں ہاتھوں سے کان ڈھانپ لیتا ہے۔ اس بار تشنج کے اثر سے اس کی بے جان، ٹانگیں بھی لرزنے لگتی ہیں۔

— یہ آوازیں — یہ بو — قریب — میری ٹانگیں — بھاگوں کیسے؟ ذلیل — تم نے میری ٹانگوں کو —

— سانس ضائع نہ کیجئے آقا — آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے — لمحے ایک ایک کر کے مرتے جاتے ہیں۔ جلدی کیجئے آقا — معاہدے کی رو سے۔

آقا تشنج میں لرزتے ہاتھوں سے تکیئے کے نیچے کچھ تلاش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ غلام اب بڑی تیزی کے ساتھ تیسری دیوار کو اخباری کاغذ سے ڈھانپنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

— میں نے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں آقا — ایک ایک تفصیل کا خیال رکھا ہے — چراغ، اگربتیاں — وہ دیکھیے، دیوار کے ساتھ آپ کی تصویر بھی پڑی ہے — آپ کے لئے گلاب کے پھول بھی آتے ہوں گے — اور تلاوت — تلاوت بھی — میز کے نیچے دیکھیے — ٹیپ ریکارڈر پر سپول چڑھے ہیں — بس — صرف لمحے کا انتظار ہے۔

آقا کا کانپتا، لرزتا ہاتھ بالآخر تکیئے کے نیچے چابیوں کے گچھے سے ٹکراتا ہے۔ وہ گچھے کو

تکیے کے نیچے سے برآمد کر کے اپنی حسرت بھری نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔

—— فرینڈز، رومنز، کنٹری مین —— السلام علیکم —— میں اپنے اس آخری وقت میں اعلان کرتا ہوں کہ تمھاری مرضی، خدا کی مرضی ہے اور میں نے خدا کی مرضی کے خلاف چل کر دیکھ لیا ہے کہ آج میں نے خود اپنی فنا اپنے ہاتھوں اپنے مقدر میں کی تمھارے ہاتھ، جو تم نے اس ظالم، سنگدل، خود غرض، موقع پرست، ابن الوقت ——

وہ غلام کی طرف دیکھتا ہے جو کمرے کی پر کھینچے سیاہ کمخواب پردوں کو اخباری کاغذ سے نصف ڈھانپنے کے بعد بڑی محبت سے آقا کی انگشت شہادت سے لٹکے چابیوں کے گچھے کو دیکھتا ہے۔ آقا کی آواز تشنج میں تھرکتی ہے:

—— اب تو —— آہنی —— ان —— کو، آوا —— بو —— کو بد ——

—— آپ کی سوچ میں تسلسل ختم ہو رہا ہے —— لفظ بے ربط —— لائیے چابی دیجئے۔

—— میرا وقت آگیا ہے؟

—— نہیں، میرا وقت آگیا ہے، جلدی کیجئے تاکہ لہو کے سمندروں میں ڈوبتی ابھرتی، گندم پسینے، گریس کی اہلتی بو، ہتھیاروں سے کٹتی، ہتھیاروں کو کاٹتی آوازوں کے سامنے ——

—— میری لاش ڈال سکو؟ باندھ —— بند —— نہ نہ نہ چابی نہ چھینو —— لو —— یہ —— لو، یہ یہاں سے قالین ہٹاؤ۔

غلام جلدی جلدی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

—— ہاں —— یوں —— اب یہ تختہ —— ہٹاؤ۔

غلام تختہ ہٹاتا ہے تو اسے زمین میں گڑا آہنی سیفٹی لاکر کا دروازہ نظر آتا ہے، اس کے چہرے پر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات چھا جاتے ہیں۔ وہ آقا کی ہدایت کے مطابق جلدی جلدی سیف پر لگی غراری کو بل پھیر دیتا ہے۔ باری باری ہر سوراخ میں چابیاں گھماتا ہے۔ آخر میں ہینڈل کو پکڑ کر زور سے دائیں جانب جھٹکاتا ہے تو کھٹاک کی آواز آتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے آقا کا تشنج اس کے اپنے ہاتھوں میں اتر آتا ہے، وہ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولتا ہے۔

ر ــــ وعدہ کردہ غلام، میرا جنازہ ــ شایا ــ شایان شان ــــ ہوگا۔

تاریکی میں غلام کو سیف کے اندر پڑی اشیاء نظر نہیں آتیں ــــ غلام آقا کے حکم پر اندر سے چیزیں نکالتا ہے۔ پہلے اس کے ہاتھ میں کاغذات آتے ہیں۔ آقا غلام سے ان کاغذات کو پڑھنے کے لئے کہتا ہے اور خود، خود کلامی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ــــ یہ، یہ ــ کون ــ؟ کہ یہ کاغذ پلیٹ پر ــ مجھے پلیٹ ــــ میں؟ وارث ــــ؟ اس لیے کہ میں ــ طاقت ــ مظہر ــ؟ میری ڈوری ــ میرے اپنے ہاتھ ــ تھی؟ شٹ اپ ــــ یہ راز خاموشی کے ساتھ میرے سینے سے تمہارے سینے میں چھوڑ دو ــــ اور دیکھو ــــ مجھے ہسٹری سے دلچسپی نہیں رہی۔ یہ، یہ کتاب۔

ــــ گناہ کی راتیں۔

ــــ اور، اور

غلام اسی تیزی سے چیزیں اٹھاتا ہے، دیکھتا ہے، رکھتا ہے، جس تیزی سے آقا حکم دیتا ہے۔ آہنی آوازیں، تیز بو، اسی تیزی سے بند کھڑکی کی جھیتوں سے داخل ہوتی ہے۔ چونکہ نکاس کا راستہ چھوٹا ہے، اس لئے کھڑکی کے سیاہ اندھے شیشوں پر بو اور آوازوں کا دباؤ بڑھنے لگا ہے۔

ــــ اور، اور،

ــــ محبتیں ــ تین، تین ــ چار چار، چھ چھ ماہ کے حرامی بچوں کی لاشیں ــــ کرم، مکھیاں، مکھیاں، کاک روچ ــــ غلام دیوانہ وار سیف میں اشیاء کو دیکھتا، اٹھاتا، رکھتا ہے ــ زمین، زمین، کارخانے، خون، پسینہ ــــ شاک مارکیٹ، دولت، دولت، دولت

ــــ اور ــــ اور ــــ اور

ــــ فوج، پولیس، سول سرونٹ۔

ــــ یہ سب تمہارا ہے ــــ تم وارث ہو۔

غلام مسکراتا ہے۔ آخر میں اس کے ہاتھ ایک انسانی کھوپڑی کو سیف سے برآمد کرتے ہیں۔ غلام کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو جاتی ہے۔ آقا آنکھوں کو ایک

ہاتھ سے ڈھانپ کر چلاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے چھڑی اٹھا کر گلوب پر وار کرنے لگتا ہے۔
—— توڑ دو —— کچل دو —— اسے —— کمبخت —— اسے —— میری وصیت —— میری فاش غلطی —— اسے کچل —— فساد —— جڑ —— بغاوت کی جڑ۔
وہ گلوب پر وار کرتا کرتا کھوپڑی پر وار کرنا ہی چاہتا ہے کہ غلام ایک ہاتھ میں کھوپڑی سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے اس سے چھڑی لے کر پرے پھینک دیتا ہے۔ آقا انگلی کو کھوپڑی کی جانب لہراتا ہے
—— تم جانتے —— یہ سوچ —— باغی —— سرخ آنکھیں —— سرخ زبان —— سرخ خیال ہم، ہم نے اس کی آنکھیں نکال —— کانوں —— لوہا —— زبان کچلی —— مگر یہ پھر بھی زندہ —— کہ ہر زبان پر اس کے لفظ —— ہر آنکھ —— اس کی نظر —— ہر کان —— کچل دو اسے —— تمھیں میری اجازت ——
—— تو آپ نے اسے کیوں نہ کچل دیا؟ —— بولیے —— جواب دیجیے۔
آقا کی زبان سے چند ٹوٹی پھوٹی آوازیں نکلتی ہیں۔ تشنج میں کسے اس کے اعضا رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں اور بے جان سا ہو کر آہستہ آہستہ بستر پر لیٹ جاتا ہے۔
—— یہ راز ہے یا آپ —— ؟ آقا —— !
—— میں —— اس —— حفاظ —— چراغ —— تم اس کی حفا —— وہ ——
آقا کی آواز اس کی زبان سے بمشکل ادا ہوتے لفظوں کو دغا دے جاتی ہے۔ اس کے ہونٹ پھڑکتے پھڑکتے ساکت ہو جاتے ہیں۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں رہتا۔ وہ سپاٹ چہرے، سپاٹ آنکھوں سے غلام کو تکتا رہتا ہے۔ غلام کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا تاثر آتا ہے۔
—— میں اس جگہ سے آغاز کروں گا جہاں آپ ناکام ہو کر دم توڑنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی موت کے بعد میرا سب سے پہلا کام یہی ہو گا کہ ان ہی کرڑوں آنکھوں، کانوں، زبانوں، ہاتھوں سے اس کھوپڑی کو ریزہ ریزہ کروا دوں، جس سے
—— غو —— غو —— رو —— رو —— شن —— ای۔

— اچھا — ! اتنی جلد — !

غلام حیرت میں جلدی سے کھوپڑی کو بند کھلی، ادھ کھلی فائلوں اور گلوب کے درمیان میز کی سیاہ سطح پر رکھ دیتا ہے۔

— غو — رو — شن — ای۔

— روشنی، روشنی ؟ میرے آقا کس رنگ کی ؟ مجھے سرخ، سرخ رنگ پسند ہے۔ غلام ایک عجیب سی مسکراہٹ سے کھوپڑی کو دیکھنے کے بعد دیوانہ وار باقی کے سیاہ کمخواب کے پردوں کو اخباری کاغذ سے ڈھانپنے لگتا ہے — لیجئے، ابھی لیجئے روشنی، پہلے یہ سفید ہو جائے، تاکہ سرخ روشنی کا تاثر بڑھ سکے — لیجئے۔ وہ تالی بجاتا ہے — روشنی۔

کمرے میں پھیکی سی، میلی سی، پیازی سی روشنی پھیل جاتی ہے۔ غلام جلدی سے آقا کی طرف دیکھتا ہے، پلٹ کر، فرش پر پڑی دیوار کے ساتھ لگی الٹی تصویر کو سیدھا کرتا ہے، جس سے آقا مسکراتا ہوا اسے دیکھتا ہے۔

کھڑکی کی جھیتوں سے آتی ہوا کے سیلاب پر ناچتی، اچھلتی، کودتی آہنی آوازوں کے شور میں گھلی گندم، پسینے، گریس کی خوشبو کا دباؤ کھڑکی کے سیاہ اندھے شیشوں پر بڑھ جاتا ہے کہ جھیتیں اب اس سیلاب کے سامنے بے بس ہیں۔ غلام پردوں کے آخری حصے پر کاغذ لگانے کے بعد پلٹ کر تیزی سے میز کی طرف آتا ہے اور میز کے نیچے تاریکی میں ڈوبے ٹیپ ریکارڈر کو آن کرتا ہے۔ آہنی آوازوں کے شور میں اٹک اٹک کر، پھنس پھنس کر ٹیپ ریکارڈر سے سورہ یاسین کی تلاوت کی آواز آنے لگتی ہے۔ آقا کے جسم کا تمام تشنج جمع ہو کر اس کے حلق میں اٹک جاتا ہے اور سانس لینے کی سعی میں، ہچکی بن کر کمرے کی فضا میں دم توڑ دیتا ہے۔ عین اس وقت آہنی آوازوں میں گھلی خوشبو کے سیلاب کا دباؤ وہیں کھڑکی کی جھیتوں میں اور سیاہ اندھے شیشوں پر ساکت ہو جاتا ہے۔ غلام تیزی سے بڑھ کر آقا کی نبض دیکھتا ہے۔ خوشی سے ہاتھ ملتا، مسکراتا ہے، بڑے اطمینان سے پلٹ کر کمرے کا جائزہ لیتا ہے۔ ہر شے اپنی جگہ ساکت، آقا کی نبض، چپ زدہ گلوب، بند کھلی ادھ کھلی فائلیں، اگربتیوں کی راکھ، چراغوں کی لاشیں، میلی سی پیازی روشنی، جھیتوں میں

آوازیں سب ساکت، صرف سورہ یاسین کی تلاوت کی آواز ہے جو برمے کی طرح اس سکوت
میں چھید کرتی ہے۔ چند لمحوں بعد غلام سیاہ رنگ میں ڈوبے ساگوان کی طرف بڑھتا ہے،
آقا کی لاش کو بڑے اطمینان سے اٹھا کر سیفٹی لاکر میں پھینک دیتا ہے۔ سیف کا دروازہ
بند کر کے تالا لگاتا ہے، اور ۳ × ۶ کا تختہ فٹ کر کے قالین کو سیدھا کر دیتا ہے، پلٹ کر
میز کے نیچے ٹیپ ریکارڈر کو آف کرتا ہے۔ دروازے کی طرف مڑ کر تالی بجاتا ہے۔

— غلام

چند لمحوں تک کوئی نہیں آتا۔ وہ میز سے ایک کھلی فائل اٹھا کر دیکھتا ہے، سنا سب صفحہ
پلٹ کر فائل میز پر رکھتا ہے۔ کوٹ کی اندر والی جیب سے فاؤنٹین پین نکال کر دستخط کرتا
ہے، پھر پکارتا ہے۔

— غلام

ایک نوجوان خوشی خوشی داخل ہوتا ہے۔ اس کے جسم میں گندم، پسینے کی خوشبو اور
لباس پر قلم کی روشنائی ہے۔ اس کے گریس زدہ کھردرے ہاتھوں نے سرکنڈے کو دونوں
سروں سے تھام رکھا ہے جس سے سرخ گلاب کے ہار لٹکے ہیں۔

— تم پہلی آواز پر کیوں نہیں آئے؟

— آپ نے مجھے بلایا تھا —؟

— ہاں۔

— لیکن میں غلام تو نہیں۔ میں تو ساتھی ہوں — میں تو آہنی جسموں پر آہنی واروں سے
نکلتی آواز ہوں — دیکھیے — میرے جسم کی خوشبو — اور — میں آپ کو ہار۔

وہ نوجوان کے ہاتھوں سے سرکنڈے سے لٹکتے ہار چھین کر سیاہ قالین پر پھینک دیتا
ہے۔ گلاب کے سرخ پھول فرش پر اس جگہ بکھر جاتے ہیں جہاں سیاہ قالین کے نیچے سیفٹی
لاکر گڑا ہے۔

— تم ہو — تم ہو غلام — اور میں آقا۔

نوجوان کے چہرے کی تمام خوشی حیرت و استعجاب کی رسمی منزل طے کیے بغیر غصے میں

ڈھل جاتی ہے۔ غصے میں لفظ اس کے دانتوں سے پچکچا کے نکلتے ہیں۔

—— تم —— ؟ فوبی!

—— تم ہو غلام کہ تمھارے مقدر میں ——

باقی جملہ نوجوان کے کانوں میں سنسناتے غصے میں کٹ جاتا ہے۔ وہ نوجوان کہ جس کے جسم میں گندم کی خوشبو، لباس پر قلم کی روشنائی اور ہاتھ گریس زدہ ہیں، لہو کی سرخی اس کی آنکھوں میں، اس کی زبان پر، اس کے خیالوں میں اُمڈ آتی ہے۔ اس کی نظریں چپ زدہ گلوب اور دستخط شدہ فائل کے درمیان پڑی کھوپڑی پر جا پڑتی ہیں۔ اس کو اس کھوپڑی میں اپنے چہرے کا عکس نظر آتا ہے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ آنکھیں سرخ، زبان سرخ، خیال سرخ، وہ آقا کو دیکھتا ہے، پھر کھوپڑی کو، پھر آقا کو، پھر کھوپڑی کو، وہ لپک کر کھوپڑی کو اٹھا کر سینے کے ساتھ بھینچ لیتا ہے، آواز کی پوری قوت سے دھاڑتا ہے۔

—— یوریکا۔

اور آقا کو اس لفظ کی بازگشت میں بند چھوڑ کر چشم زدن میں کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ آقا نوجوان کی اس غیر متوقع حرکت پر سناٹے میں آجاتا ہے۔

عین اس وقت سفید اخباری کاغذ سے ڈھنپے سیاہ پردوں کے پیچھے، کھڑکی کے سیاہ شیشوں میں سے ایک، آواز اور خوشبو کے دباؤ سے مجبور ہو کر تڑختا ہے۔ شیشہ تڑخنے کی آواز کانوں میں پڑتے ہی اس کا جسم حرکت میں آتا ہے۔ وہ دیوانہ وار بھاگ کر کھڑکی کے سامنے اپنی پوری طاقت کے ساتھ اخباری کاغذ سے ڈھنپے سیاہ پردوں کے ساتھ ٹیک لگا دیتا ہے، جیسے یہ بند، تیز ہوا پر سوار آتی پسینے، گندم اور گریس کی خوشبو کو، تیز ہوا پر خود کو متوازن کرتی، آہنی جسموں سے ٹکرا کر تیز دھار آروں سے الجھتی آوازوں کو، ٹوٹتے ہوئے سیاہ اندھے شیشوں کی کناروں سے زخمی لہولہان ہو کر تڑپتی، مچلتی، اڑتی، پھیلتی، ایک دوسرے میں ڈوبتی، ابھرتی خوشبودار آوازوں کو ساری کائنات میں سیلاب کی صورت پھیلنے سے روک ہی لے گا۔

جاجیمے کیچیا اور میں

جاجیمے کیچی ما:

میں سترہ برس کا بھوک کا بہت ستایا ہوا، ہر جگہ روٹی کی تلاش میں پہنچ جاتا ہوں۔ ممنوعہ علاقوں میں بھی، اپنا پیچھا کرتی پولیس سے بچتا بچاتا۔ ادھ سڑے، ادھ گلے آلو میری غذا۔ میں کھاتا ہوں، قے کرتا ہوں۔ کھاتا ہوں، قے کرتا ہوں۔ میں آوارہ کتا، تاریک سایوں میں کوڑے کرکٹ سے پیٹ بھرتا ہوں۔ میں صرف اپنے بے باک خوابوں، منہ زور خواہشوں میں زندہ ہوتا ہوں۔ شہوت کی تسکین کے لئے، پوسٹروں پر مسکراتی، اجنبی دوشیزاؤں کے ساتھ چپٹ کر سو جاتا ہوں۔ میں تنہا، میں صفر، کہ ان گنت مفلسوں میں ایک مفلس، گلیوں میں بھٹکتے ہجوم میں ایک گمنام نوجوان، اجنبی چہروں کے ساتھ چل رہا ہوں۔ حق ہے، مجھے بھی حق ہے کہ چاول کھانے کی خواہش کروں۔

خواہشوں کی تعبیر

جس کے حصول میں، میں ایک ایسے شہری میں ڈھل رہا ہوں جو بے اختیار، انقلابی جذبوں سے لیس ہو رہا ہے۔

میں:

خواہشوں کی تعبیر

جس کے حصول میں، میں کہ جو بے اختیار، انقلابی جذبوں سے لیس ہو کر اس شہری میں ڈھل رہا تھا، میرے خوابوں کو اب دشمن ٹکٹکی لگائے دیکھتا ہے۔ میں، کہ جو اپنے خوابوں کے دشمن کی ٹکٹکی سے بندھا، تند و تیز کوڑے اپنے جسم پر سہہ رہا ہوں، بازاروں میں پھرتے ہجوم، جانے پہچانے پر اجنبی چہروں کے ساتھ چل رہا ہوں۔ تنہا نہیں کہ صفر نہیں پھر بھی ان گنت مفلسوں میں ایک مفلس، شہوت کی تسکین کے لئے پوسٹروں سے جھانکتی، خوفناک، جانی پہچانی

چڑیلوں کے ساتھ جپت کرتا ہوں۔ میں صرف اپنے خوابوں میں محبوس، خوف زدہ، مستقبل کی روشنی اپنی آنکھوں میں قابو کیے زندگی کر رہا ہوں۔ میں آوارہ کتا نہیں جو تاریک سایوں میں کوڑے کرکٹ سے پیٹ بھرے۔ میں کہ، اشرف المخلوقات، مجھے کوئی حق نہیں کہ گندم کے خوشے کو اپنے مقدر میں کرنے کی خواہش بھی کروں۔ ادھ گلی، ادھ سڑی سبزیاں اور چچوڑی ہڈیاں میری غذا، کھاتا ہوں، قے کرتا ہوں۔ کھاتا ہوں، قے کرتا ہے۔ ممنوعہ علاقوں میں بھی پیچھا کرتی پولیس سے بچتا بچاتا، پہنچتا ہوں۔ بھوک کا ستایا ہوا،

میں سترہ برس کا،

پھر کہانی کا آغاز بن گیا ہوں

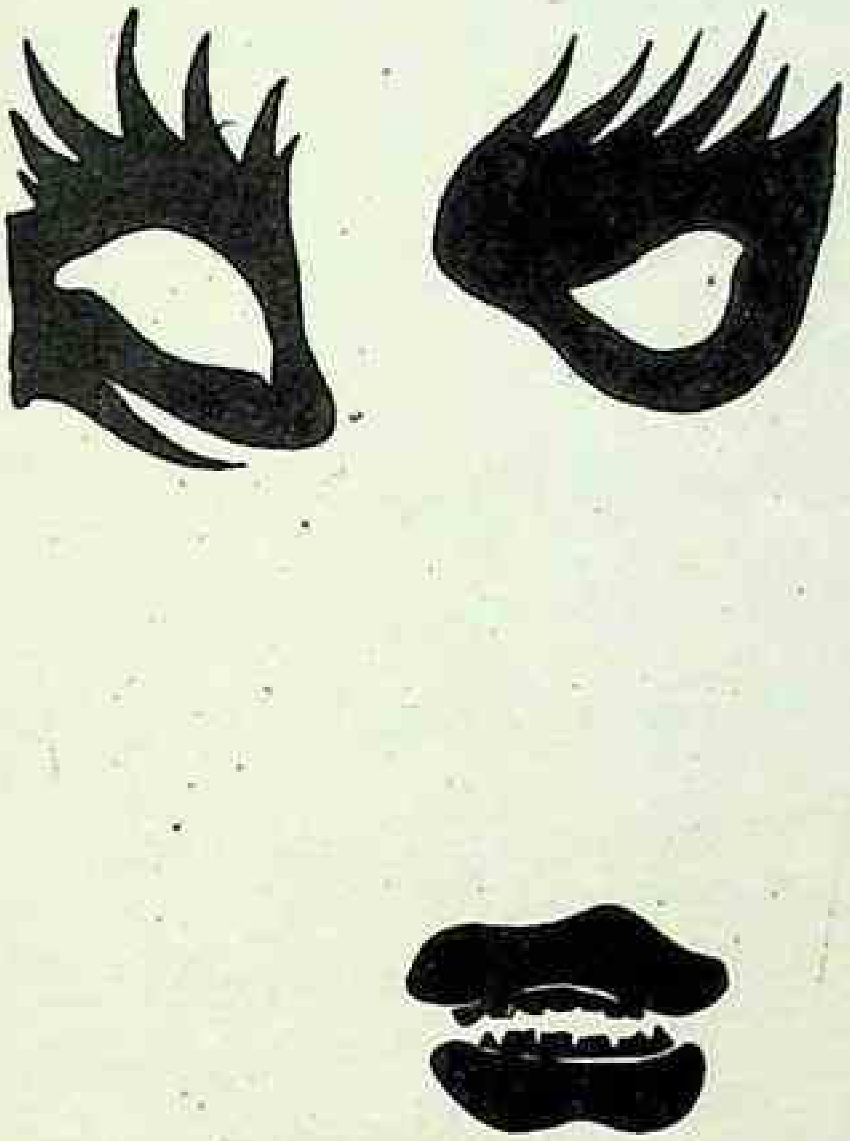


دی آئیڈز آف مارچ

نئی کونپل

ماں اور بیٹا

سی گل



دی آئیڈز آف مارچ

سہ پہر کی دھوپ کومل، شفاف، نکھری نکھری، مارچ کے پھولوں کی خوشبو بچوں کی ہنسی میں کھلکھلاتی، دھیرے دھیرے چلتی ہوا کے ہونٹوں پر پھیلتی ہے۔

شہر کی رگ میں اترتی چھوٹی چھوٹی بے شمار گلیاں، جن میں اگر ٹریفک لائیٹس نہ ہوں تو بھی لوگ صاف شفاف نکھری نکھری، مارچ کے پھولوں کی کومل روشنی میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا جاتے اور اسی طرح ایک دوسرے کو غصیلی نظروں سے گھورتے اپنے اپنے راستوں پر چل دیتے۔

ایک انجانی سی تشویش خواہ مخواہ رونگٹوں میں سر اٹھاتی ہے۔ تب لمحہ بھر کے لیئے شہر کے آسمان اور شہر کی زمین پر سکوت چھا جاتا ہے۔ شہر کے بند دروازوں، مکان کی کھلی کھڑکیوں، تسبیح کے دانوں اور لوگوں کے خشک گلوں میں اٹکا دھیان کا ایک لمحہ جو پھیل کر صدیوں پہ محیط ہونے کی خواہش کے رونگٹوں میں سر اٹھا لیتا ہے۔

اس سکوت کے لمحے کو دُور آسمان سے سر اٹھاتی بجلی کی کڑک آہستہ، بہت ہی آہستہ شہر پہ تنے آسمان میں یوں پھیلتی ہے جیسے دُور، بھیانک تاریک جنگلوں میں کسی قریب المرگ زخمی بھیڑیے کے حلق میں پھنسی چیخ کی آخری غرغراہٹ جو مارچ کی نکھری نکھری، کومل، شفاف، پھولوں کی خوشبو، بچوں کی ہنسی اور ماؤں کے دودھ سے بوجھل سنہری دھوپ میں دھیرے دھیرے بہتی ہواؤں کے سینے میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے، جو ابھی شہر کی شہ رگ پر اثر انداز نہیں ہوا۔ شہ رگ میں لہو کے خلیے ابھی ایک دوسرے سے بچتے بچاتے رواں دواں ہیں۔ زندگی کی دھڑکن۔

دھڑکنیں۔ اور کوئی آواز نہیں۔

اس بند گلی کے آخری مکان کی نچلی منزل میں کوئی آواز نہیں ، ساتھ والے گھر کے صحن میں ایک بچہ برف کے گولے کھانے کے لئے ضد کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ والے گھر کے اندر کہیں دروازہ چرچرانے کی آواز آتی ہے ۔ باقی گھروں کی آوازیں اس بند گلی کے آخری مکان کی نچلی منزل کے گلی میں کھلتے دروازے تک نہیں پہنچ پاتیں ۔ اس بند دروازے کے پیچھے اور کوئی آواز نہیں سوائے دو دلوں کی دھڑکن کے ۔

دو دلوں کی دھڑکنیں، ایک دوسرے سے ایک قدم کے فاصلے پر، جن کی آواز اس سے پیشتر کہ رفتہ رفتہ اونچی ہوتی اس عروج پر پہنچے کہ لڑکے اور لڑکی کے نوجوان صحت مند سینوں کو پھاڑ کر نکلے، دروازے کے بند کو توڑ دے، شہر کے بند دروازوں، مکانوں کی کھلی کھڑکیوں، تسبیح کے دانوں، لوگوں کے خشک گلوں میں اٹکا سکوت کا لمحہ پھیل جاتا ہے، دھیان کا ایک لمحہ ۔

تب دھیرے دھیرے بہتی ہواؤں میں پھیلتا ارتعاش، شہر پر پھیلے آسمان میں چھاتی ہوئی حاملہ بدلیوں میں کراہنے لگتا ہے ۔ تیز حیرت زدہ ہوائیں پھنکارتی ہیں، جس کے باعث گلیوں، بازاروں، سڑکوں پر چار سو کٹے پھٹے روزناموں، ہفت روزوں کی خبریں ایک دوسرے سے الجھتی ٹکراتی، لوگوں کی آنکھوں میں تن تن جاتی ہیں ۔ شاید اسی لئے گلیاں تو گلیاں، شہر کی شہ رگ میں بھی لوگ ٹریفک لائیٹس کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا جاتے ہیں ۔

نیم وا کھڑکیوں، بند دروازوں کو جھنجھوڑتی تیز ہوائیں ٹین کے خالی ڈبوں کو لڑھکاتی، کھڑکاتی، دیوانے کتوں کی طرح بھونکارتی، آسمان پر حاملہ بدلیوں کے بطن کو جھنجوڑتی ہیں ۔

بارش کے بڑے بڑے قطرے، موسلا دھار، شوریدہ

لیکن بند گلی میں آخری مکان کے گلی میں کھلنے والے بند دروازے کے پیچھے صرف دو دلوں کی دھڑکنوں کی آواز، ایک دوسرے سے ایک قدم کے فاصلے پر ۔ ایک دل نوجوان کنواری کے سینے میں، دوسرا نوجوان لڑکے کے سینے میں ۔

شکستی، دل دہلاتی کڑک، جیسے بجلی بند دروازے سے باہر گری ہے [illegible] کا دل لمحہ بھر

کے لئے رُک جاتا ہے۔ لڑکا فوراً ہاتھ بڑھا کر لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے جسے لڑکی کھینچ کر اپنے دل کے اوپر رکھ لیتی ہے۔ بائیں چھاتی پھر دھڑکنے لگتی ہے۔ گرج چمک بار بار، دونوں آنکھیں موند لیتے ہیں۔ لڑکا ایک آنکھ کی جھری سے دیکھتا ہے کہ ایک قدم کی خلیج پہ پل بن گیا ہے۔

لڑکا اب اس پُل سے گزر کے جلد از جلد خلیج پار کر لینا چاہتا ہے کہ آج موقع ہے۔ فوراً خاوند بننے کی خواہش بالکل اسی طرح اس کے رونگٹوں میں سر اٹھا لیتی ہے جیسے چپ سادھے سیاہ بادلوں میں رات کو شہر کی بجلی فیل ہو جانے پر شہر کے رونگٹوں میں انجانی سی تشویش۔ لشکتی، دل دہلاتی کڑک، جیسے بجلی ایک بار پھر بند دروازے کے باہر گری ہے۔ لڑکے کی مُندی آنکھیں کُھل جاتی ہیں اور وہ یکدم لڑکی کو کھینچ کر اپنے سینے سے چمٹا لیتا ہے لیکن ایک قدم کا فاصلہ طے ہونے کے باوجود خلیج حائل رہتی ہے۔ لڑکے کی آنکھوں میں جال کے ڈورے تن جاتے ہیں۔ لڑکے کے بازوؤں میں پھنسی تڑپتی لڑکی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا سانس کیوں گھٹ رہا ہے۔ وہ حیرت سے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتی خود کو اس کی آنکھوں سے چھڑاتی ہے، خاموشی سے اس کے بازوؤں کی مضبوط گرہ کو پوری قوت سے کھولتی ہے۔ بھنچے ہونٹوں میں گھٹی گھٹی آواز سے کہتی ہے۔

—— چھوڑ دو —— چھوڑ دو مجھے —— کیا کر رہے ہو؟

چشمِ زدن میں وہ کنواری دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ جاتی ہے۔ لڑکا اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کنواری کے دوپٹے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ لڑکی پلٹ کر اس کی طرف دیکھے بغیر بارش کی چادر سر پہ سنبھال کے تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کو چل دیتی ہے۔

فوراً خاوند بننے کی خواہش میں لڑکے کا تمام جسم، اس کا چہرہ، اس کے کان، اس کا سینہ، اس کا بازو، اس کی ٹانگیں، اس کی رانیں، غصے، جھلاہٹ اور بیزاری میں تمتمانے لگتی ہیں۔ وہ کنواری کے دوپٹے کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر اس سے اپنے جسم کے ایک ایک جلتے، بھڑکتے، دھڑکتے روئیں کو بجھانے کی کوشش کرتا گلی میں آ جاتا ہے۔ اس کی نظریں ہر اوَر گم ہوتی کنواری پر جال پھینکتی ہیں۔ بارش کے آخری چند قطرے بھی اس کے دھڑکتے بھڑکتے

جلتے روڈوں پر تیل ہیں۔ جب وہ ان لپٹوں میں اور بھی گھر جاتا ہے تو دوپٹے کو گلی میں پھینک کر اسے پیروں میں روندتا اس اور بھاگنے لگتا ہے جہاں پر شریان شہ رگ میں جا ملتی ہے۔

شہ رگ میں دوڑتی، دھڑکتی، ہمکتی زندگی اپنے ہی لہو کی بارش میں ڈوب چکی ہے۔

بارش زدہ سنسان چوراہوں میں اینٹیں بکھری پڑی ہیں۔ ٹریفک لائٹیں چکنا چور ہو چکی ہیں۔ فٹ پاتھوں سے کافی پرے، فلک بوس عمارتوں کی غلام گردشوں میں لوگ چھوٹی ٹولیوں میں بٹے آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں اور کبھی کبھی، آنکھوں پر پڑی روز ناموں، سنت روزوں کی لیروں کو ہٹا کر سوچتے ہیں کہ زندگی میں ایسا لمحہ بھی آ جاتا ہے کہ جب کوئی ہارنے والا جیتنے والے کی جیت کو حیلوں بہانوں، جذباتی باتوں، اندرونی بیرونی سازشوں سے شکست میں تبدیل کرنے کی سعی کرتا ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ایک ہی گلی، ایک ہی بازار، ایک ہی شہر، ایک ہی ملک، ایک ہی دنیا میں رہنے والے لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ایسے دن کو حساب کا دن جان کر اپنی اپنی نامرادیوں کو کندھوں پر اٹھائے اپنی مقبول وفاؤں کا خون بہا طلب کرنے گلیوں، بازاروں، سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور کومل، شفاف، نکھری نکھری، بچوں کے ہونٹوں پر کھلکھلاتی ماؤں کی دودھ سے بوجھل چھاتیوں میں گرم مہکتی مارچ کی روشن خوشبوؤں میں بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا جاتے ہیں، اور ایک انجانی سی تشویش شہر کے رونگٹوں میں سر اٹھانے لگتی ہے۔

وہ نوجوان جو وقت سے پہلے ہی خاوندی کا طالب تھا، شریان اور شہ رگ کے سنگم پر کھڑا اپنے جلتے، بھڑکتے، دھڑکتے روڈوں میں تڑپتا، سنسان چوراہوں میں پھیلے سناٹوں اور سرگوشیوں کے جال سے خود کو چھڑاتا ہے۔ پھر تیزی سے جھک کر پاس پڑا اینٹ کا ٹکڑا اٹھاتا ہے اور ہجوم کے عتاب سے بچی کھچی، تنہا ٹریفک لائٹ پر پل پڑتا ہے جو پہلے سبز سے پیلی ہوئی تھی اور اب سرخ ہے۔

نئی کونپل

کنواریوں، بھورانیوں، ماؤں کے سروں میں راکھ ڈال کر ان کے سروں کو چادروں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔

کنواریاں، بھورانیاں بستی کے چوراہے میں جلے بودھی کے درخت کے ٹھنٹھ کے گرد بیٹھی سروں میں پڑی راکھ کو چادروں میں سمیٹے اپنی ان نوحہ کرتی ماؤں کے آنسو خشک کرتی ہیں جن کے نوجوان بیٹوں کو چوراہوں پر چھتر چھاؤں کئے بودھی درخت کے تنے کے ساتھ باندھ کر کوڑے مارے گئے ہیں۔ ان کے بودھی کے تنے ایسے تنومند جسموں پر برستے کوڑوں سے کھدتے راجباہوں سے سرخ سرخ دھڑکتی زندگی قطرہ قطرہ، قطرہ قطرہ ٹپک کر، زمین میں پھیلی بودھی درخت کی جڑوں میں جذب ہو گئی ہے کہ ماؤں کے ان بیٹوں نے، بھورانیوں کے ان شوہروں نے، کنواریوں کے ان بھائیوں نے ان گدھوں کے پنجوں سے بستی کی زندگی چھڑانا چاہی ہے، ان گدھوں کے سروں سے نکلتی تیز دھار، سرد آہنی سنگینوں پر چڑھا اپنا حق چھیننا چاہا ہے جن کی غذا مردار ہے لیکن کھانے کی ہوس اتنی شدید ہے کہ زندہ بھی انہیں مردہ نظر آتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ہر غلام کا نام سپارٹےکس ہے جو بودھی درخت سے بغل گیر ہو کر اپنے جسم پہ کوڑوں سے راجباہ کھدواتا ہے تا کہ سرخ سرخ، دھڑکتی زندگی قطرہ قطرہ، بودھی درخت کی زمین میں پھیلی جڑوں کو سیراب کرے اور نیچے جب اس کی شاخوں سے نکلتی داڑھیوں میں گرہیں دے کر ان میں جھولیں تو ان کے کانوں میں سرخ سرخ تازہ زندگی سنسناتے سرسراتی ہوا ان کے کانوں کو زندگی کرنے کے راز سے آگاہ کرے۔

تو، بودھی درخت اب راکھ ہو کر خاک ہو چکا ہے جس کی داڑھی میں گرہیں دے کر بچے زمانوں سے جھولتے آتے تھے اور جس کی شاخوں میں سرخ سرخ لہو ایسے پھول دھڑکتے تھے۔

بستی کے چوراہے میں جلے ہوئے بوڑھی درخت کا ٹھنٹھ، اٹوٹ خاموشی اور ہوا کہ جہاں سے گذرتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس بستی کے بیشتر، جلے ادھ جلے گھروں کی دیواروں، سوختہ نیم سوختہ کھڑکیوں دروازوں سے تو کیا جب صحیح و سالم مکانوں کی کھڑکیوں دروازوں سے بھی گزرتی ہے تو چپ۔ اٹوٹ خاموشی۔

کنواریاں، بھورانیاں راکھ سے اٹے سروں پر چادریں سنبھالتی، بین کرتی ماؤں کے آنسو خشک کر کے اب انہیں گھروں میں لے آئی ہیں، جن کی چار دیواریوں سے باہر تحفظ کے لئے پہرہ لگا دیا جاتا ہے۔

ماؤں کے نوحوں پر بھی چپ کی مہر ہے۔

صرف خاموشی ہے اور ہوا، جس پر پڑے تالوں کو تجسّس سے کانپتی مونچھوں اور حیرت سے تکتی آنکھوں والی گلہریوں کے نرم گدے وار، بھاگتے پیر بھی توڑنے سے قاصر ہے۔

یہ بستی اب ان بستیوں میں سے ہے جہاں خاموشی ہو تو بولے ہوئے لفظ کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ بولا ہوا لفظ جو ہر منہ میں زبان بن جاتا ہے۔ جو سپاڑے کس کو خطرناک باغی بنا دیتا ہے تو آقا ان کے تنومند جسموں کو بوڑھی درخت کے تنوں کے ساتھ باندھ کر کوڑوں سے ان پر راجباہ کھودتے ہیں۔ جسم جو پھر مجسّم زبانوں کا روپ ڈھال لیتے ہیں، انہیں کال کوٹھڑیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جب یوں ہوتا ہے کہ وہ ان دیکھا، ان سُنا، ان چھُوا جذبہ لفظوں کے اختیار سے نکل جاتا ہے تو ان خلاؤں کو خلق کرتا ہے جو ایسی ہی حقیقت ہوتے ہیں، جسے دیکھا جا سکتا ہے، سُنا جا سکتا ہے، چھوا جا سکتا ہے۔ تب وہ باپ، بھائی، بیٹے، شوہر جنھوں نے اپنی زبانوں کو اپنے منہ کی قید میں ڈال رکھا تھا، جن کے جسم برستے کوڑوں کے تصور ہی سے لرز لرز اٹھتے تھے، جن کے سر نیوڑھا کر، جن کی آنکھوں کو جھکا کر ان کے جذبوں، ان کی محبتوں، ان کی زندگی کرنے کی خواہشوں کو ان کی رانوں کے بیچ خصّی کر کے ہلوں میں جوت دیا گیا تھا، اس خلا کی حقیقت کو اپنی آنکھوں، اپنے کانوں، اپنے جسموں، اپنی زبانوں میں سر اٹھاتا محسوس کرتے ہیں کہ مائیں اپنی گودیں ان پر وا کرنے سے انکار کر دیتی ہیں؟

بہنیں بیٹیاں اپنے خواب اپنے اوپر حرام کر لیتی ہیں اور بیویاں بستروں پر پھیلے اپنے بدن

سمیٹ لیتی ہیں۔ چولہے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ان پر چڑھانے کے لئے بھوک، ننگ، حسرت و یاس، امید و بیم کے سوا کچھ نہیں۔ صرف ہوا ہے یا اٹوٹ خاموشی۔

اتنی خاموشی کہ ساری کائنات کا تجسس لیے، چوراہے سے ہٹ کر روڑی کے گرد کھیلتے بچوں کا شور، چیخ چہاڑا، کھلکھلاہٹیں بھی سنائی نہیں دیتیں۔ وہ روڑی میں قلعے بناتے ہیں، ڈھاتے ہیں، پھر بناتے ہیں۔ ان قلعوں میں خزانوں کو تلاش کرتے ہیں کیونکہ بوڑھی درخت کی شاخیں، سرخ سرخ پھول، اس کی داڑھیوں کے جھولے تو سب راکھ ہو کر خاک ہو چکے ہیں صرف ٹھنٹھ باقی رہ گیا ہے جو انہیں اپنے چمکیلے پتوں، سرخ سرخ پھولوں ایسے روشن جزیروں کی کہانیاں نہیں سنا سکتا۔

خاموشی۔ اٹوٹ خاموشی۔

اور یا پھر ہوا ہے جس کے اپنے لبوں پر تالے پڑے ہیں کہ ابھی کنواریاں، بھورانیاں اپنے سروں سے چادریں نوچ پھینک کر، چار دیواری کے حصار کو توڑ کر مستقبل کو جنم دینے کی خواہش میں باہر نہیں نکلتیں۔ ابھی بستی کے جوانوں کا بوڑھی کی جڑوں میں ٹپکتا لہو ان کی کوکھوں میں نوحہ کناں ہے تڑپ بن کر لہروں کی صورت ان کے بطن میں نہیں جاگا کہ مائیں ابھی چار دیواریوں میں محصور آیت کریمہ کا ختم پڑھتی ہیں اور آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر رب العزت سے سوال کرتی ہیں، ان کا یہ کشٹ کب کٹے گا؟ بوڑھی درخت کی شاخوں سے لٹکتی سرخ روشن قندیلیں بجھا دی گئی ہیں، اب روشنی کہاں سے آئے گی؟

پھر ایک زمانے کے بعد کنواریاں، بھورانیاں ہر روز ہر روز کی اس آہ و بکا سے اکتا جاتی ہیں جس کا کوئی ثمر نہیں اترتا۔ آسمان سے نہ زمین سے۔ ان کی اکتاہٹیں بے چینیوں میں اور بے چینیاں ہیجانوں میں بدل جاتی ہیں۔ ان کی رانوں کے اندر تنے ہوئے تار جھنجھنا جاتے ہیں، دودھ کے سوتے جگانے کے اہتمام میں ان کی چھاتیاں گر ڈھلکنے لگتی ہیں اور تاریک کال کوٹھریوں ایسی کوکھوں میں نئے سورج کو جنم دینے کی خواہش جوالا بن جاتی ہیں۔ وہ باہر کو لپکتی ہیں۔ مائیں کہتی ہیں۔

—— بیٹھو، بھورانیو، سب بے سود ہے۔ چوراہے کی روشنی تو انہوں نے راکھ کر دی۔

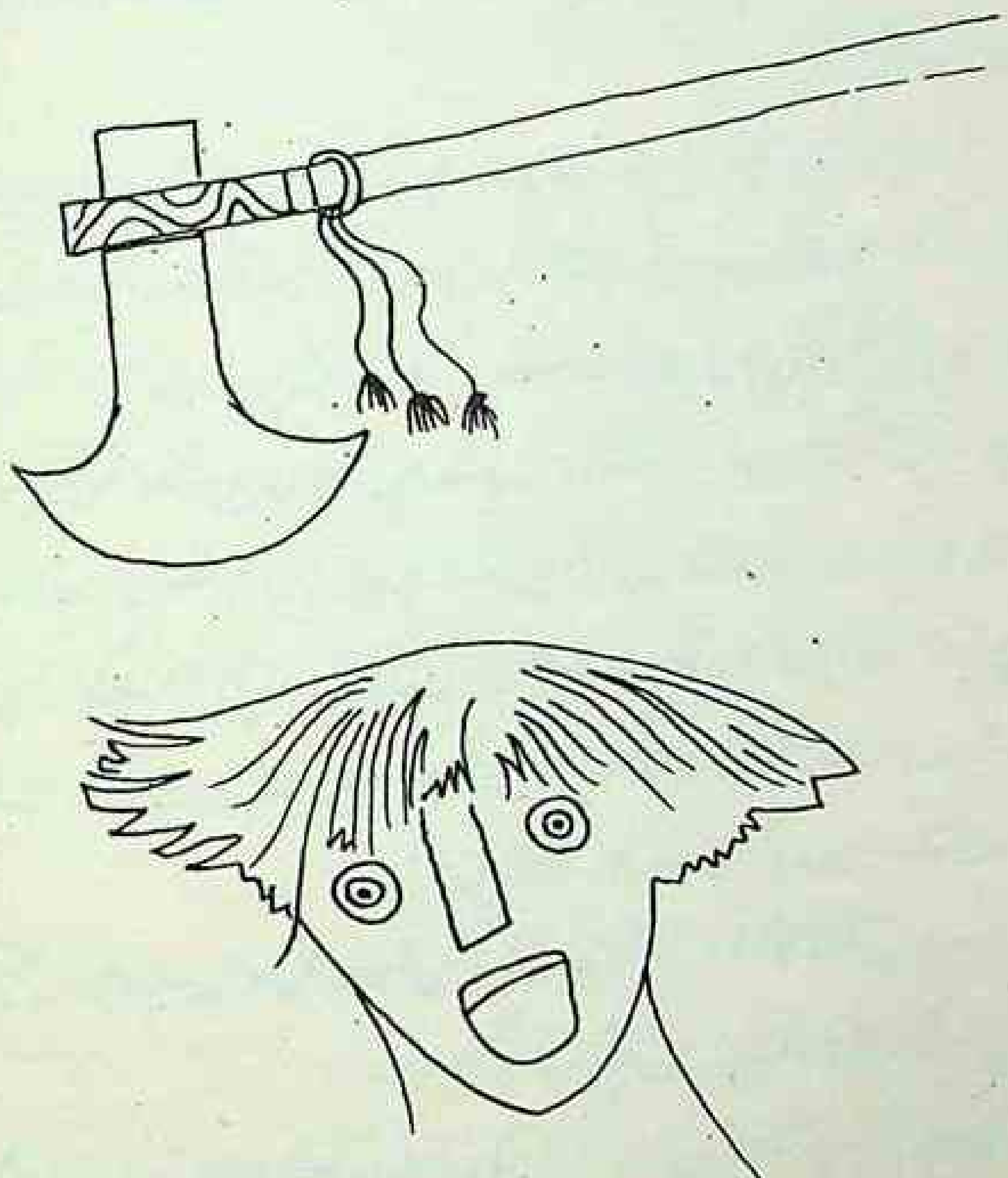
کنواریاں، بھورانیاں ماؤں کی سنی ان سنی کر دیتی ہیں کہ وہ جانتی ہیں جس بودھی درخت کو جلا دیا گیا ہے، جس کے تنے کے ساتھ تنومند جوانوں کو باندھ کر ان کے جسموں پر کوڑے برسا کے راجباہ کھودے گئے ہیں، ان راجباہوں سے سرخ سرخ، دھڑکتی زندگی قطرہ قطرہ، قطرہ قطرہ ٹپک کر بودھی کی جڑوں میں جذب ہو چکی ہے اور اب ایک زمانے کے بعد اس جلے ہوئے ٹھنٹھ کی نیو سے سُرخ سُرخ، کومل کومل، ننھی منی کونپل پھوٹ نکلی ہے اور مائیں جو اپنے زمانوں میں اپنے سورجوں کو جنم دے چکی ہیں، ان کے بطن سے اٹھتی، درد کی لہروں کے عذاب کو نہیں جان سکتیں۔

کنواریاں، بھورانیاں اپنے سروں سے چادروں کو نوچ پھینک کر، چار دیواری کے حصار کو توڑ کر، نئے سورج کو جنم دینے کی خواہش میں اینٹھتی تڑپتی کوکھوں کے درد کو ہاتھوں سے سنبھالتی باہر نکل آتی ہیں۔ ان کے سیلاب کے سامنے پہرے دار، گدھ، سنگینیں، آنسو گیس، گولیاں، فیتے، تمغے سب خس و خاشاک ہو جاتے ہیں۔ محلوں میں چھپے خصی شوہروں کی زبانوں، ان کے جسموں سے ان خلاؤں کی حقیقتیں آزاد ہو جاتی ہیں جو لفظوں کے اختیار سے باہر، ان چھوئے، ان دیکھے، ان سنے جذبے خلق کرتی ہیں کہ وہ اپنی ماؤں کی گود ہرا ہونے کے لئے ترستے ہیں، بہنوں بیٹیوں کے خواب ان کی حُرمت ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کی بیویوں کے بدن ان کے بستروں پر کسی اور کے لئے کھِل جائیں۔

یہ سیلاب کٹتا کاٹتا، اٹھتا گرتا گراتا، اس اور رواں دواں ہے جہاں مجسم زبانوں کو زنجیریں پہنا کر کال کوٹھریوں میں پھینک دیا گیا ہے۔

تو دیکھو، جب کنواریوں، بھورانیوں کی رانوں کے اندرون تنے ہوئے تار جھنجھنا جاتے ہیں، دودھ کے سوتے جگانے کے اہتمام میں چھاتیاں گرھکنے لگتی ہیں اور تاریک کال کوٹھریوں ایسی کوکھوں میں نئے سورج کو جنم دینے کی خواہش اینٹھتی، تڑپتی، جوالا بن جاتی ہے تو ایسے ہی میں کال کوٹھریوں میں کٹی زبانیں زمین میں جڑ پکڑ لیتی ہیں، جہاں روشنی، ہوا، نمی کا گزر تک نہیں ہوتا۔ صرف زبانوں کی نم آلود سرخی ہوتی ہے۔ جب ان میں پہلی کونپلیں پھوٹتی ہیں تو اندھیرا چھٹتا ہے، خاموشی کے تالے ٹوٹتے ہیں، ہوا آزاد ہو کر گنگناتی

ہے ۔ ان پودوں کے بیچ بستی بستی چوراہوں میں بوڑھی درختوں کی صورت چھتر چھاؤں بنتے ہیں
اور ان کے بطن سے تنومند کنوارے جسموں کی خوشبو لیئے، وہ سرخ سرخ پھول طلوع ہوتے
ہیں جن کی کرنوں کو اپنے بس میں کر کے تاریک دنیاؤں کے تاریک انسان اپنا مقدر روشن
کرتے ہیں ۔



ماں اور بیٹا

۹ نومبر ۱۹۷۷ء

پیارے بیٹے، آج سے تقریباً سولہ سترہ برس پہلے میں نے ایک کہانی ایک امریکی جریدے میں پڑھی تھی۔ مجھے لکھنے والے کا نام یاد رہا نہ کہانی کا۔ جریدہ غالباً ایور گرین ریویو تھا۔ اس کہانی نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔ ان دنوں جانے کیوں یہ کہانی مجھ پر پھر آسیب کی طرح سوار ہے۔ میں اس آسیب سے نجات کی کوشش میں وہ کہانی تمہارے لئے اپنے حساب سے بیان کرتا ہوں ——————— تمہارا، انور۔

راستے میں ڈھول، جو اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی تھی، ابھی تک نہیں بیٹھی۔ زمانے نے ماں کو پہلے اپنا شوہر پھر دو بیٹے قربان کرتے دیکھا۔ اب اس نے یہ آخری نوجوان بیٹا، خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والا اپنے وطن، اپنی قوم پر قربان ہونے کو بھیجا ہے۔

وہ گھر کی دہلیز سے باہر دیوار سے ٹیک لگائے مسلسل اس راستے کو تکتی ہے جس پر جاتے اس کے بیٹے کے قدموں سے اٹھی ڈھول ابھی تک فضا میں معلق ہے۔

جب گولیوں کی آواز، دھواں اور بارود کی بو چھٹتی ہے تو لوگ ماں کو گھر کے ملبے کے نیچے سے نکالتے ہیں، بغیر بازوؤں، بغیر ٹانگوں کے اب یہ اعضا ملبے میں ملبہ ہو چکے ہیں۔ صرف آنکھیں ہیں جو اس اور جمی ہیں جس اور اس کا بیٹا گیا ہے۔

ہسپتال سے واپسی پر، اس کی خواہش کے مطابق اسے اس گھر کی بچی کھچی چار دیواری میں ادھ گرے دروازے کی دہلیز میں دیوار کے ساتھ ٹیکا کے بٹھا دیا جاتا ہے۔ جب اسے

بھوک پیاس لگتی ہے تو راستے پر آتے جاتے کسی سے بھی کہہ دیتی ہے۔ لوگ اس کی خدمت کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں کہ اس نے اپنا آخری بیٹا بھی وطن کی سالمیت، آزادی کے لیے داؤ پر لگا دیا ہے۔ طالع آزماؤں، غاصبوں کی سنگینوں، گولیوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار میں اپنی آخری اینٹ چن دی ہے۔

ماں کو ہر وقت احساس ہوتا ہے کہ اس کے بازو اور ٹانگیں سلامت ہیں لیکن جب مانوس مانوس قدموں کی آواز سن کر چونکتی ہے کہ سر سے ڈھلکتی چادر کو سر پر درست کر کے اٹھ کر، دو قدم بڑھ کر، بازو وا کر کے آنے والے کو سینے سے لگا سکے تو ہاتھ، بازو اور ٹانگیں حرکت میں لانے کے باوجود وہ وہاں سے ہلتی تک نہیں۔ وہ حیرت سے اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور ٹانگوں کو دیکھتی ہے جو اپنی جگہ پر نہیں ہیں اور اس کے گھر کے ملبے میں ملبہ ہو چکے ہیں۔ تب اس کی آنکھوں سے شوہر اور دو بیٹوں کی یاد اور تیسرے بیٹے کے لیے امید قطرہ قطرہ ٹپکنے لگتی ہے۔ وہ اس راستے کی فضا میں معلق دھول سے نظریں چرا کر آنکھیں جھکا لیتی ہے کہ وہ بہت باوقار ماں ہے۔

کبھی کبھار اس کے بیٹے کا خط آ جاتا ہے، اس کی تاریک راتوں اور تاریک دنوں میں روشنی لے کر۔

پھر ایک عرصہ گذر جاتا ہے کہ اس کے بیٹے کا خط نہیں آتا۔ جو اچھی بری خبریں لوگ اسے سناتے ہیں، وہ ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ اسے صرف اپنے بیٹے پر ایمان ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کا دکھ، درد، غم، بازو، ٹانگیں سب مسکراہٹ کی صورت میں اس کے ہونٹوں پر بکھرے رہتے ہیں، اس کا دل کبھی کبھار ایک دھڑکن رک جاتا ہے کہ ابھی کوئی خط، کوئی تار آیا جس میں

پھر رفتہ رفتہ دن رات کی تاریکی، بڑھتی تاریکی کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ بھی تاریک پڑنے لگتی ہے۔

اور جب سوچ تاریک پڑ جاتی ہے تو یاس اور ناامیدی کے لئے غذا بن جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ ماں کی بھوک کی طرح اذیت بھی سرد پڑ جاتی ہے۔ یوں ہی ہوتا ہے کہ جب جسم و جان

کو اذیتیں ڈستی ہیں تو جسم اس زہر کا عادی ہو جاتا ہے اور جان بھی۔ پھر نیند لمبی ہوتی ہے یا نیم بے ہوشی۔ لیکن دیکھو کہ اس نیند، اس نیم بے ہوشی میں بھی ماں کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں اور اس راہ کو تکتی ہیں جس راہ میں، اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی دھول ابھی تک نہیں سمٹی۔

پھر ایک بڑی ہی عام صبح کو گولیوں کی چنگھاڑتی آوازیں ماں کو جھنجھوڑ کے جگا دیتی ہیں۔ وہ اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس راہ پر ان گنت لوگوں کو دیکھتی ہے جو چیختے، کراہتے، لنگڑاتے، گرتے پڑتے، اٹھتے راستے کی دھول کا پردہ اوڑھے اس کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ ماں کے سینے میں کوئی طوفان نہیں اٹھتا۔ محبت اور آنسوؤں سے بھرے دل میں کوئی موج نہیں اٹھتی۔ اس کی تمام حسیں، تمام جذبے اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سو چکے ہیں، نیم بے ہوش ہو چکے ہیں۔

—— بھاگو، جان بچاؤ —— ہمیں شکست ہو گئی ہے۔ دشمن آ رہا ہے۔

یہ آواز گولیوں کی طرح چیختی اس کے کانوں کے قریب گزر جاتی ہے۔

ماں کے ہونٹوں پر سارا دکھ، درد، غم، ٹانگیں اور بازو مسکراہٹ کی صورت اس کے ہونٹوں پر اور بھی پھیل جاتے ہیں۔

چشم زدن میں راستہ سنسان ہو جاتا ہے اور چاروں طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔

پھر اس نقطے سے جہاں، سناٹے میں رچا راستہ افق میں اترتا دکھائی دیتا ہے، دھیرے دھیرے، رفتہ رفتہ ایک ساتھ زمین پر پڑتے بہت سارے بھاری قدموں کی آواز اسے اپنی طرف بڑھتی سنائی دیتی ہے۔ ماں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ساتھ زمین پر پڑتے ان قدموں کی آواز اس کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ہم آہنگ کیوں ہے۔

چند لمحوں بعد اس دھول سے، جو اس کے بیٹے کے جاتے قدموں سے اٹھی تھی اور ابھی تک فضا میں معلق تھی۔ نوجوانوں کا دستہ نمودار ہوتا ہے جنہوں نے اس کے اپنے وطن کی زرہ بکتریں پہن رکھی ہیں۔ ان سب کے آگے، ان سب میں خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہے جسے دیکھتے ہی ماں کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ سینے میں طوفان

اُمڈ آتا ہے اور محبت اور آنسوؤں سے بھرا دل پھٹ جاتا ہے۔

—— میرے بیٹے، میرے لعل

سب اس آگے والے خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والے نوجوان کے حکم پر ہالٹ ہو جاتے ہیں اور اپنے ہتھیاروں کا رُخ اس عورت کی جانب کر کے دھول کے پردے سے اسے دیکھتے ہیں، جس کے منہ سے اچانک گولیوں کی طرح یہ لفظ نکلے تھے، میرے بیٹے، میرے لعل۔ وہ خوبصورت، توانا، نوجوان، جس کے چوڑے چکلے سینے پر دمکتے تمغے دم بھر کے لیے دم سادھ لیتے ہیں، ایک قدم اس عورت کی طرف بڑھتا ہے۔

—— تم یہاں کی حاکم ہو؟

—— نہیں۔ میں تمھاری ماں ہوں۔

—— میں اس فوج کا کمانڈر ہوں اور میں نے تمھارے ملک کو فتح کر لیا ہے۔

ماں آنسوؤں میں رچے اس پیار سے جو ماؤں کے دلوں سے نکل کر زبانوں پر امڈ آتا ہے، مسکرا کے کہتی ہے۔

—— یہ ملک تمھارا ہی ہے میرے بیٹے۔

—— جھوٹ۔ تمھیں غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنا ہوں گے —— ورنہ گولی ——

—— میں تمھاری ماں ہوں۔ اور یہ ملک تمھارا ——

وہ سُنی ان سنی کر دیتا ہے۔

—— کمانڈر ہونے کی حیثیت سے مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ اب یہ تمھارے ضمیر پر منحصر ہے کہ تمھارے لیے کون سا فرض متعین کرتا ہے۔

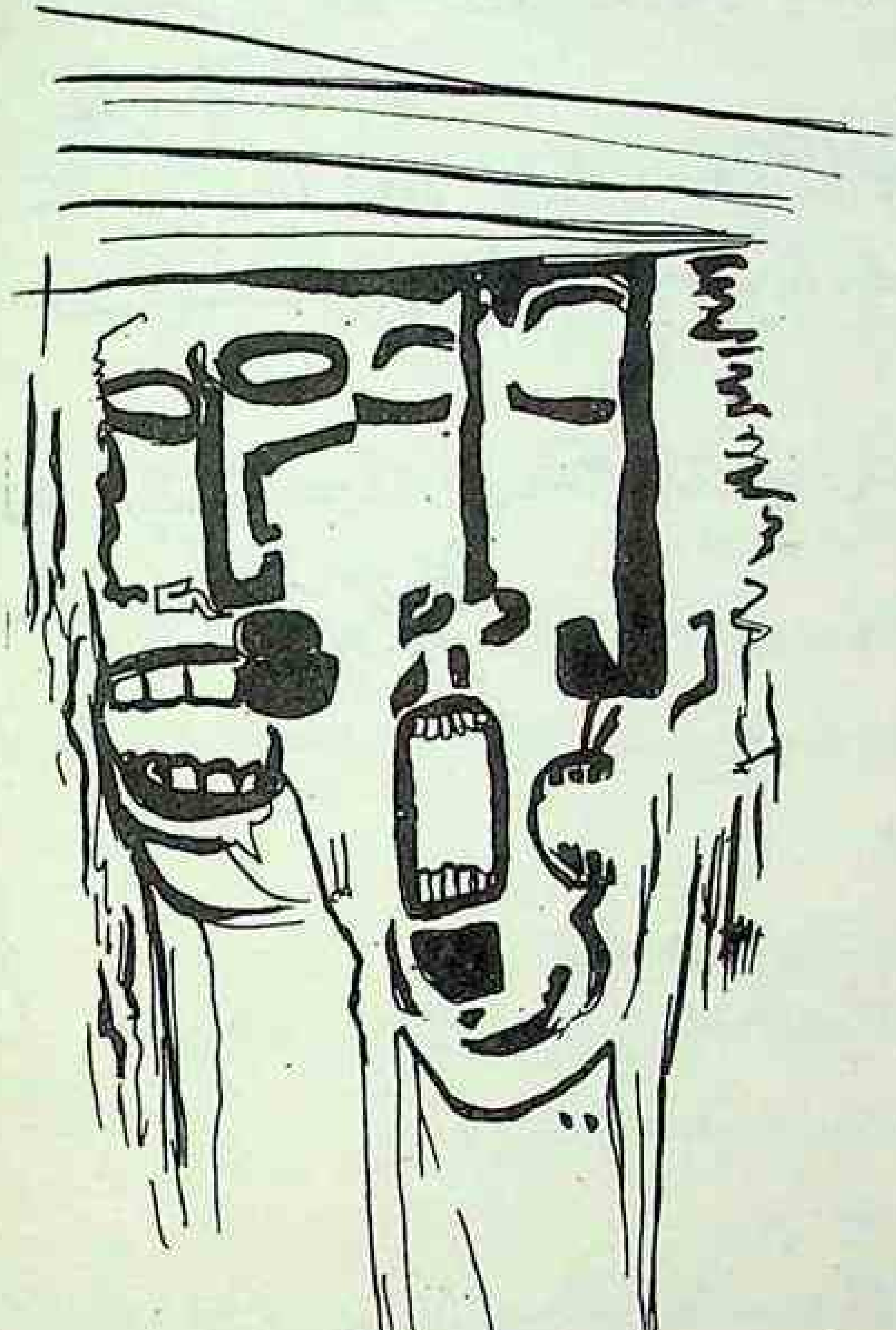
کمانڈر کے یہ الفاظ اس عورت کی اس روح، اس جذبے، اس جرأت کو جھنجھوڑ دیتے ہیں، جس سے اس نے پہلے اپنے شوہر کو، پھر دو بیٹوں کو، پھر اپنے آخری نوجوان، خوبصورت، توانا، چوڑے چکلے سینے والے بیٹے کو اس راہ پر روانہ کیا تھا۔ وہ چیختی ہے۔

—— غنڈے، بدمعاش، قاتل، غاصب —— میں کبھی ہتھیار نہیں ڈالوں گی، میں تمھیں فنا کر کے ——

کمانڈر ایک لمحہ آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور بڑے اطمینان سے اس عورت کو گود میں اٹھا کے اس راستے پر ڈال دیتا ہے جہاں دھول ابھی فضا میں معلّق ہے۔ اس کے ساتھیوں کے ہتھیاروں کی نالیوں کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر اس عورت کا سینہ، نحیف و نزار، فاقہ زدہ سینہ جس پر کوئی تمغہ نہیں اور جس میں ایک دل فخر سے دھڑکتا سنائی دیتا ہے، پورے فخر سے پھول جاتا ہے۔

چند سیکنڈ بعد جب گولیوں کی آواز، دھواں اور بارود کی بو چھٹتی ہے تو کمانڈر یہ اطمینان کیے بغیر کہ وہ عورت ٹھیک سے مری بھی ہے نہیں اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیتا ہے۔

ماں کی نظریں اپنے بیٹے سے ہٹ کر اس راہ کو تکتی ہیں جس پر اس کے جاتے بیٹے کے قدموں سے اٹھی دھول، ابھی تک نہیں بیٹھی۔



سی گل

یہ مستطیل کمرہ کسی قلعے کا اسلحہ خانہ دکھائی دیتا ہے۔

دیواروں پر لگی ڈھالوں کے گرد پھول کی پتیوں کی طرح دائرے میں جڑے بڑے بڑے خنجر، ایک دوسرے کو دستوں سے کاٹتی تلواریں جن کی گولائیوں کے درمیان ڈھال، پوری دیوار میں لگی الماری جس میں سے جھانکتے چھوٹے خنجر، مختلف ناپ اور ساخت کی تلواریں، ڈھالیں، زنجیر دار زرہیں، خود، تیر کمان، کلہاڑیاں، نیزے۔ اس کے سامنے کی دیوار بھی شیشے کی الماری جس سے لمبی نال والے پستول، توڑے دار بندوقیں دکھائی دیتی ہیں۔ چاروں کونوں میں خودوں سمیت، ایک ہاتھ آگے بڑھائے، دوسرے میں نیزہ لئے زرہ بکتریں کھڑی ہیں۔ ان سب کے اندر کے آدمی مدت ہوئی ختم ہو چکے ہیں۔

یا شاید ختم نہیں ہوئے۔ ذرا سوا نوری کے لئے گئے ہیں کہ ان زرہ بکتروں سے آتی پسینے کی بُو ابھی زنگ آلود محسوس نہیں ہوتی۔

چھت سے کرسٹل گلاس کا بہت بڑا فانوس بہت وزنی لوہے کی زنجیر سے لٹکتا ہے۔ فانوس کا حجم اور زنجیر کا وزن اتنا ہے کہ بڑے سے بڑا زلزلہ بھی آجائے تو نہیں ڈولتا۔ اس فانوس میں موم بتیوں کی شکل میں ڈھلے لاتعداد قمقمے ہیں جو سوئچ آن ہونے کے باوجود اس وقت روشن نہیں۔ شاید اس کے سرکٹ میں کوئی خرابی ہے۔ بظاہر اس کے اندرونی اور بیرونی نالطے ٹھیک ٹھاک ہیں کیونکہ تھوڑی دیر پہلے تاروں کا معائنہ کیا گیا تھا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔

فرش پر دیوار سے دیوار تک بیش قیمت قالین بچھا ہے جس پر پاؤں رکھو تو جیسے تازہ دھنکی

* SEA - GULL

روئی میں دھنس جائیں۔

چھاگیلے ربڑ کی گدیوں والی منقش ساگوانی آرام کرسیاں جن کے سامنے اخروٹ کی لکڑی سے بنی منقش میزیں۔ فرنیچر اور سامانِ آرائش سے محسوس ہوتا ہے کہ کمرے کی تزئین کسی کھردرے تخیل کے مالک کی خواہش کے مطابق کی گئی ہے جسے اپنی شائستگی، شستگی اور ذوق پر بڑا زعم ہے۔

دو دیواروں میں لانبی لانبی محرابی کھڑکیاں بند ہیں۔ ان پر کمخواب کے دبیز پردے پڑے ہیں۔ اندر آنے والا محرابی دروازہ نہیں کھلا کہ ابھی اس پر پڑے کمخواب کے دبیز پردے ساکت ہیں۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ ساگوان کا بہت بڑا پلنگ ہے جس پر بچھے چھاگیلے ربڑ کے گدّے پر سنہری ساٹن کا بستر، پروں سے بھرے سنہری ساٹن کے دو تکیے۔

یہ سب کچھ سامنے ساگوان کی بڑی میز پر پڑے لیمپ کی مدھم سنہری سی روشنی میں اتنا مدہم مدہم سا سنہرا دکھائی دیتا ہے جیسے کنواریوں کی نیم وا، نیم خوابیدہ آنکھوں میں ٹمٹماتے بے یقین سے خواب۔

بستر پر ابھی کوئی سلوٹ نہیں پڑی کہ کنواریوں کی آنکھوں میں ٹمٹماتے سنہرے بے یقین سے خواب ابھی اس شخص کی آنکھوں میں آکر عصمت باختہ نہیں ہوئے جو ساگوان کی میز کے سامنے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑا بہت بے چینی سے پلٹتا ہے، بے قراری سے سگریٹ کے چند کش لے کر ایش ٹرے میں بجھا دیتا ہے پھر نیا سگریٹ سلگا لیتا ہے۔

—— وہ ابھی تک آئی کیوں نہیں؟

وہ بڑبڑاتا ہے اور بے صبری سے دروازے کی طرف دیکھتا ہے، اس جگہ کا فاتح، جس کی یہ خوابگاہ اسلحہ خانہ دکھائی دیتی ہے۔

باہر حبس میں دم گھٹتی، باسی پسینے میں گچ گرم رات کے باوجود کمرے کا درجۂ حرارت سنہرے بستر پر اپنی آنکھوں سے کنواریوں کے عصمت باختہ خواب اتارنے کے لئے بہت مناسب ہے کہ یہ عمارت مرکزی طور پر ائیر کنڈیشنڈ ہے۔

—— اسے اب تک آجانا چاہئے۔

وہ شخص جس کا چہرہ اس کے تخیل کی طرح کھُردرا ہے، سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتا، نیم ہیجانی کیفیت میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ٹہلنے لگتا ہے۔ اس کے جسم کا رُواں رُواں بے قراری کے پسینے میں لرزتا ہے لیکن اس کے پسینے کی بو ابھی زنگ آلود نہیں ہوئی کہ وہ ابھی ابھی مغربی کونے والی زرہ بکتر سے نکل کر آیا ہے جس کے سینے پر تمغے سجے ہیں۔ وہ ٹہلتا ہوا اس زرہ بکتر کے سامنے جا کر لمحہ بھر کے لئے رُکتا ہے، پھر تڑپ کر پلٹتا ہے اور تیزی سے قدم اٹھاتا جا کے سامنے کی دیوار میں لگی شیشے کی الماری سے ٹیک لگا کر اپنے بے قرار سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

—— میں نے تمھیں حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے، تمھیں کروڑوں ہاتھوں سے چھیننے کے لئے کونسا حربہ استعمال نہیں کیا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بے شکن سنہرے بستر پر تیتریوں کی طرح اڑتے کنواریوں کے خواب بستر پر دراز ہوتے ہوتے ان تاریک گوشوں میں گم ہو جاتے ہیں جہاں ساگوان کی میز پر پڑے لیمپ کی مدہم مدہم سنہری سنہری روشنی پہنچ نہیں پاتی۔

تاریک گوشوں میں ان تیتریوں کے تاریک ہوتے ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔

—— فیوز اُڑ گیا ہے شاید۔

وہ اپنی آنکھیں ملتا چیختا ہے۔

—— گارڈز۔

عین اسی وقت محرابی دروازہ کھلتا ہے، کمخواب کے دبیز پردے وا ہوتے ہیں۔

وہ بڑی تمکنت سے پُروقار انداز میں ایک ہاتھ میں مشعل لئے اور دوسرے ہاتھ سے صحیفے کو سینے سے لگائے داخل ہوتی ہے۔

وہ دم بخود رہ جاتا ہے اور مشعل کی روشنی میں دیکھتا ہے۔

اس دوشیزہ نے اپنے جسم کو کتان کی چادر کے کئی کھلے کھلے گھیروں میں سنبھال رکھا ہے۔ کمربند کے پھندنے اس کے گھٹنوں سے لگے ہیں۔ اس کے سر پر تاج ہے، اس تاج سے مختلف جواہر دلہنیں پہنتی ہیں۔ اس تاج کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ پل بھر میں یوں محسوس ہوتا ہے

کہ سر پر پہنے اس تاج کی کرنیں ذرا دور جا کے فضا میں جامد ہو گئی ہیں اور دوسرے پل یوں لگتا ہے جیسے کرنیں نہیں لمبے لمبے کانٹے ہیں۔

جب اس کا سانس نوجوان مغرور چھاتیوں تلے پھیلے سینے میں سمٹے پھیپھڑوں میں اس کے لہو کو زندگی دے کر اور زندہ لہو سے زندگی کی حرارت لے کر اس کی ستواں ناک سے رواں ہوتا ہے تو جیسے زمانے آزاد ہو کر کائنات میں پھیل پھیل جاتے ہیں۔

اور جب وہ سکوت اختیار کرتی ہے تو سات سمندر پار حریت کی دیوی کا باوقار پرشکوہ مجسمہ کہ جس کی حیثیت آج ایک عجوبے کی ہے پر صدیاں پہلے جسے ایک قوم کے حریت پسندوں نے دوسری قوم کے حریت پسندوں کو نیک تمناؤں کے اظہار کے طور پر بھیجا تھا اور جنہوں نے اس تحفے کو اپنی بندرگاہ سے ذرا دور ایک چھوٹے سے جزیرے میں نصب کر دیا تھا کہ ہر آنے والے کا سواگت اور جانے والے کو وداع کرے۔

تو کمرے میں داخل ہوتے ہی اس دوشیزہ کے جسم سے اٹھتی، سمندروں اور زمینوں کے طلاپ کی خوشبو چھا جاتی ہے۔ وہ ساتھ والے کونے میں کھڑے زرہ بکتر کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں مشعل تھما دیتی ہے اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے صحیفے کو زرہ بکتر کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے نیزے میں پرو دیتی ہے۔

وہ اپنے سینے سے اچھل کر حلق میں آتے دل کو بمشکل سینے میں سنبھال کے اپنے انعام کو مشعل کی مدھم ہوتی، سمٹتی، سنہری روشنی میں دیکھتا ہے۔ وہ انعام جسے وہ اپنے اندرونی بیرونی ساتھیوں کی مدد سے کروڑوں ہاتھوں سے چھین کر اس کی مغرور نوجوان چھاتیوں کے وسط میں بچھو کا سر ڈنک رکھ کر اس خوابگاہ میں لایا ہے جو ان قلعوں کا اسلحہ خانہ دکھائی دیتی ہے جن میں بچھے بستروں پر کنواریوں کے سنہری تیتریوں جیسے اڑتے تھماتے خواب ان کی نیم وا نیم خوابیدہ آنکھوں ہی میں بجھا دیئے جاتے ہیں کہ ان کی حرمت کے محافظوں کی رانوں میں وہ بچھو ڈنک اٹھانے لگتے ہیں کہ اگر انہیں کنواریوں کی نوجوان مغرور چھاتیوں کے وسط میں رکھ کر انہیں ان خواب گاہوں میں آنے پر مجبور کر دیا جائے تو محافظ ان بچھوؤں کے زہر سے تڑپتے رہیں، پل پل مرتے رہیں کہ ہوس کے ڈنک جتنے ہی زہریلے ہوتے ہیں۔

تو دیکھو، اس مشعل کی مدہم ہوتی ہوئی سنہری روشنی میں اگر دیکھ سکتے ہو کہ اس دوشیزہ
نے، جو پل پل ٹمٹماتا سنہرا خواب لگتی ہے، اپنا تاراج مکٹ آثار کے مدہم ہوتی مشعل کو پہنا
دیا ہے اور کمربند کے پھندے نے پیچ کھینچ دیئے ہیں۔ اس کے بدن سے کتان کے گھیرے پھسلتے
سرکتے، کمربند سمیت دھنکی ہوئی روئی ایسے قالین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔
اس کا جسم زمینوں اور سمندروں کے ملاپ سے اٹھتی خوشبو ہے جس کا کوئی رنگ نہیں
یا تمام رنگ اس میں سمٹے ہیں۔
ایک قطرہ پانی اور ایک ذرہ مٹی میں رچی گئی سورج کی ایک کرن،
منطقہ حارہ کا پھول۔
اب وہ اسے بستر کی طرف بڑھتا دیکھتا ہے۔
اس دوشیزہ کے چلنے کے انداز اور چہرے کے تاثرات سے محسوس ہوتا ہے کہ صدیوں
سے ظالم ہاتھوں نے اس کی مدافعت کے باوجود کہ اس جسم پر زخموں کے نشان اب بھی
نظر آتے ہیں، اس کے شعور اور لاشعور کو گڈمڈ کر کے ان کی سوئیاں وقت کے ڈائل پر
اس طرح بٹھا دی ہیں کہ اب وہ ڈائل کے نیچے خول میں بند مشینری کی حرکت کے تابع ہیں۔
وہ اسی طرح میکانکی انداز میں آہستہ آہستہ چلتی بستر کی طرف بڑھتی ہے جس پر بچھی
ساٹن کا اب کوئی رنگ نہیں کہ مدہم ہوتی مشعل کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچتی۔
اگرچہ عروسی کی ایسی راتوں میں روایت کے مطابق حجلہ عروسی نہیں بنایا جاتا، وہ شخص
حسرت سے سوچتا ہے، کیا حرج تھا اگر پھولوں کی سیج بچھا دی جاتی، خوشبوؤں کی مسہری
بُن دی جاتی، وہ تو کنوارہ ہے۔
پر جلدی اور زبردستی کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔
آہستہ آہستہ نپے تلے قدم، نوجوان مغرور چھاتیاں، پورے چاند ایسے پیٹ کے درمیان
چھوٹی سی گول ناف، بھرے بھرے کولہے اور گداز رانیں جن کے اتصال سے ابھرتی تکون
کا نرم ابھار، یہ سب کچھ بستر کی طرف آہستہ آہستہ اٹھتے قدموں کی حرکت سے یوں ذرا سا
لہر سا جاتا ہے جیسے ٹپ ٹپ قطرہ بارش سے پرسکون جھیل کی سطح۔

یہ آج بھی اسی طرح شگفتہ ہے، تر و تازہ، خوشبو بھری، پر وقار، جوانی کا غرور لئے، منطقہ حارہ کا پھول۔

وہ جیسے اس شخص کی موجودگی سے بے خبر، دھیرے دھیرے آکے بستر پر دراز ہو جاتی ہے اور چھت سے وں بھاری زنجیر کے ساتھ لٹکتے کرسٹل فانوس پر نظریں جما دیتی ہے جس کا سوئچ اگرچہ آن ہے پر اندرونی اور بیرونی رابطے میں خرابی کی وجہ سے شمع نما قمقمے روشن نہیں ہیں، بھاری بھرکم فانوس جسے بڑے سے بڑا زلزلہ بھی ہلا نہیں سکتا۔

عین اس وقت اس شخص کی رانوں میں بچھو دم اٹھا لیتا ہے۔

اور اسی دم وہ مشعل بجھ جاتی ہے جسے وہ دوشیزہ زرہ بکتر کے ہاتھ میں پھنسا کر اسے اپنے پراج مکٹ پہنا کر آئی ہے۔

کمرے میں مکمل تاریکی چھا جاتی ہے۔

وہ شخص اپنے جسم میں پھیلتے تاریکی کے خوف سے کانپ سا جاتا ہے۔ پھر فوراً خود پر قابو پا لیتا ہے۔ بجلی جانے کی وجہ سے ایرکنڈیشنگ کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ پسینے میں بھیگا، اپنا لباس جلدی سے وہیں اتار دیتا ہے اور بڑے اعتماد سے مسکراتا اس اور دیکھتا ہے جہاں پلنگ ہے۔

تاریکی میں دوشیزہ کے ردِ عمل کا پتہ نہیں چلتا۔

حبس میں اس شخص کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ وہ تاریکی میں بڑھتا، راستے میں پڑی میز کرسیوں سے الجھتا ٹکراتا سامنے والی کھڑکی کی طرف لپکتا ہے، دیوار کو ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر جلدی سے محرابی کھڑکی پر پڑے کمخواب کے پردے ہٹا کر کھڑکی کھول دیتا ہے۔

باہر آسمان پر جھلملاتے ستارے، جیسے کنواریوں کے خواب، اپنے محبوبوں کے ساتھ اُدھل جانے کی خواہشوں میں تھرکتی بیتریاں۔

شہر تاریک اور سنسان جیسے اژدہا سونگھ گیا ہے۔

کمبخت فیوز کو بھی آج ہی اڑنا تھا، وہ سوچتا ہے۔ کھڑکی سے ہوا تو آتی رہے گی۔

پہ ہوا کو بھی جیسے وہی اژدہا اپنے پھیپھڑوں میں سمیٹ کرلے گیا ہے۔

وہ روزنگٹوں میں سرسراتے تاریکی کے ہراس کو ایک بار پھر اپنے بدن سے بہتے پسینے میں غرق کر دیتا ہے اور ایک بار پھر پر اعتماد اس اور دیکھتا ہے جہاں اس کی نگاہیں تاریکی میں سنہرے بستر پر اس دوشیزہ کا ہیولہ تخلیق کرتی ہیں ۔ پھول کے سنہرے تکئیے پر سیاہ بالوں میں کھلا چہرہ، فانوس پر جمی بادامی آنکھیں، نوجوان مغرور چھاتیاں، پورے چاند ایسے گول پیٹ کے وسط میں ناف، بھرے بھرے کولہے، گداز رانیں جن کے اتصال سے بنا مکونا نرم ابھار۔

وہ اس کے بدن میں مٹی، سمندروں اور زمین کے ملاپ کی خوشبو کو سونگھتا، اپنی رانوں میں ان گنت بچھوؤں کے ڈنک سہتا، بے خود، بے صبر، ہاتھ پھیلائے، تاریکی میں راستہ ٹٹولتا بڑھتا ہے۔

اس کے ہاتھ پلنگ سے مس ہوتے ہیں ۔ وہ بستر پر بیٹھ جاتا ہے۔

بچھوؤں کا زہر اس کی رانوں میں اس شدت سے آگ دہکا دیتا ہے کہ وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیئے وہ تمام ابتدائی مراحل نظر انداز کر دیتا ہے جو اس نے سوچ رکھے تھے کہ وہ یوں اسے چھوئے گا، اس کے بدن کے ریشے ریشے، گوشے گوشے کو چومے گا، چاٹے گا، رام کرے گا اور پھر

پھر اگرچہ سب کچھ آسانی سے ہو جاتا ہے پر وہ اسے اندر سے بیجان پا کر حیران رہ جاتا ہے اور پریشان بھی کہ اس دوشیزہ کی طرف سے کوئی آہ کراہ، ننوں نہیں ہوئی ۔ اسے پیچھے دھکیلنے کے لیئے اس کا کوئی ہاتھ نہیں اٹھا، اس کے سینے پر کوئی ٹھوکر نہیں پڑی، کوئی مدافعت نہیں کہ جو اس کی رانوں میں جلتی آگ کو ذرا اور بھی بھڑکا دے کہ جبر کی لذت، اور ہی ہوتی ہے۔ شاید وہ بھول گیا ہے کہ صدیوں سے جابر ہاتھوں نے اس کی مدافعت کے باوجود کہ جس کی گواہی اس کے بدن پر زخموں کے نشان ہیں، اس کے شعور اور لاشعور کو گدیڑ کر کے ان کی سوئیاں وقت کے ڈائل پر اس طرح بٹھا دی ہیں کہ اب وہ ڈائل کے نیچے بند مشینری کی حرکت کے تابع ہیں۔ دوشیزہ کے منہ سے آتی عجیب سی سڑاند کے باعث اسے ابکائی سی آ جاتی ہے۔

بیعین اس لمحے دور سے آتی آواز گھر گھر، گلی گلی، سڑک سڑک، چوک چوک سارے شہر میں رچی ساکت تاریک فضا کو چیرتی ہے۔

—— ماں۔

اور شہر کے زخموں میں صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔

— ماآآاں ں ں۔

وہ دوشیزہ کی ٹانگوں میں پھنسا، حیران و پریشان نظریں اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے۔ کنواریوں کے خواب، تیتریوں کے غول، لاتعداد جگنوؤں کے سیلاب، کی صورت سڑک پر منڈلائے ہیں۔

صدائے بازگشت شہر میں گلی گلی، سڑک سڑک، چوک چوک گھومتی یوں سنائی دیتی ہے جیسے ساکت سمندر پر چھائی گہری سرمئی، دھندلائی، چاند فضا کو چیرتی تنہا سی گل کی کرلاٹ، گونجتی ہوئی۔

—— ماآآاں ں ں۔

وہ گھبرا جاتا ہے۔ اس کی آگ بڑی سرعت سے دوشیزہ کے بطن میں بجھ جاتی ہے۔ کمرہ یکدم روشن ہو جاتا ہے۔ اس کی نظریں وہیں بیٹھے بیٹھے چھت کی طرف اٹھ جاتی ہیں کہ چھت سے بھاری زنجیر کے ساتھ لٹکتے اس فانوس کے تمام شمع نما قمقمے روشن ہو جاتے ہیں جو بڑے سے بڑے زلزلے میں بھی نہیں ڈولتا اور اب دیوانہ وار جھوم رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ فانوس تو ساکت ہے اور کمرہ روشنی کے زلزلے میں ڈول رہا ہے۔

تنہا پکار، زلزلے کی لہریں۔

وہ وہیں دوشیزہ کی ٹانگوں میں بیٹھا چھوٹے سانسوں سے کھڑکی سے باہر پھر دیکھتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے کہ بھڑکتے جگنوؤں کا سیلاب اب کھڑکی سے بہت قریب آن پہنچا ہے۔

یہ پٹرول کرنے والے کہاں مر گئے۔ وہ سوچتا ہے۔

سڑکوں پر کروڑوں تیتریوں کے پروں کی طرح جھلمل جھلمل مشعلیں، کنواریوں کی آنکھوں میں جگمگ جگمگ خواب، جو آنکھوں سے آزاد ہو کر بے شکن شہر کے بستروں پر پھیل جانے کی خواہش میں ایک ہی آواز بن کر پکارتے ہیں۔

ـــ ماآآآں ں ں

حریت کی دیوی کے مجسمے کی نوجوان مغرور چھاتیوں کے عین وسط سے تڑپ کر نکلتی تنہا سی گل کی کرلاٹ، زمانوں کی فضاؤں کو چیرتی، شہر کے زخموں میں بازگشت۔

ـــ گارڈز

وہ رو ہانسا ہو کر چیختا ہے پر چیخ اس کے حلق ہی میں اٹک جاتی ہے کہ اچانک دروازے کے پڑا کمخواب کا پردہ ہٹتا ہے اور ایک تنومند نوجوان بائیں ہاتھ میں مشعل بلند کئے داخل ہوتا ہے۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی اس نوجوان کے پیر دہلیز ہی میں جم جاتے ہیں، جیسے سکتے میں۔

یہ کمبخت گارڈز کہاں مر گئے۔ وہ جھنجھلا کے سوچتا ہے۔ نوجوان کو وہاں کھڑا دیکھ کر گھبرا کر دوشیزہ کو دیکھتا ہے۔

دوشیزہ، جیسے ڈائسیکشن ہال کی پتھریلی میز پر پڑی متعفن لاوارث لاش۔ اس کی آنکھیں ڈوبتے فانوس پر جمی جیسے اپنا سارا نور فانوس میں روشن شمعوں میں اتار چکی ہے۔ اس کے سیاہ پڑتے نیلے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔ اس کے مسوڑھے خشک ہو چکے ہیں۔ اس کی زرد لٹکتی چھاتیوں کی بھٹنیوں پر کائی جمی ہے۔ پروں کے سنہری تکیے پر اس کے بال یوں اُلجھے پھیلے ہیں جیسے زمین پر پھیرنے والی بوسیدہ تیلی۔ اس کے سارے بدن کی جلد، یوں سکڑ کر سلوٹوں سے بھر گئی ہے جیسے سنہرے بستر کی سلوٹیں اس کی ہڈیوں پر منڈھ دی گئی ہیں۔

منطقہ حارہ کا پھول۔

وہ، نوجوان اور اس لاش کے گھیرے میں خوفزدہ، خود کو اس کی خشک، لکڑی رانوں سے چھڑانے کی کوشش کرتا ہے پر وہ اس سکڑی تکون کی کھچی میں بری طرح پھنس کر رہ گیا ہے۔ خود کو کھینچنے، اس سے چھڑانے کی کوشش میں درد کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے۔

چیخ کی آواز سن کر مشعل والا نوجوان چونک اٹھتا ہے۔

وہ زرہ بکتر کے ہاتھ میں پھنسی دوشیزہ کی مشعل کو روشن کرتا ہے، ایک نظر مشعل پر پڑے راج مکٹ اور نیزے میں پروئے صحیفے کو دیکھتا ہے پھر دھیرے دھیرے جھک کر فرش پر بکھری کتان کی چادر کو اٹھا لیتا ہے اور نظروں میں زمانوں بھر کا غصہ، نفرت، قہر لئے آہستہ آہستہ

پلنگ کی طرف بڑھتا ہے جہاں وہ شخص اب بری طرح اس لاش کی لکڑی ٹانگوں کے وسط سے کہ جو چند لمحے پہلے دوشیزہ کی گداز رانیں تھیں، خود کو کھینچنے کی سرتوڑ کوشش کرتا تھک ہار کے ہانپتے، درد سے کراہنے لگا ہے۔ اس کا خیال فوراً دیواروں میں جڑی الماریوں میں سجے ہتھیاروں کی طرف جاتا ہے کہ لپک کر ان میں سے ایک اٹھالے، پر وہ تو بستر کے ساتھ درد سے بندھا اس دوشیزہ کے شکنجے میں جکڑا ہے جس کے لئے اس نے ہر حربہ استعمال کرکے اس کی خاوندی کا اعلان کیا تھا۔

وہ بے بسی میں خوف زدہ نظروں سے جیسے التجا کرتا ہے۔

— یہ' یہ میری دلہن ہے۔ میری بیوی۔

مشعل والے نوجوان کی آنکھوں میں مشعل کے شعلے ہیں وہ دانت بھینچ کر کہتا ہے۔

— میں، تم، ہم سب اس کے بیٹے ہیں۔ وہ دیکھو کھڑکی سے باہر۔

وہ اس شخص کو ماں کی گالی دیتا ایک ہاتھ میں کتان کی چادر لئے دوسرے ہاتھ میں وار کرنے کے انداز میں مشعل بڑھائے اس شخص کی طرف بڑھتا ہے جو ابھی تک وہیں پھنسا بیٹھا ہے۔ نوجوان چنگھاڑتا ہے۔

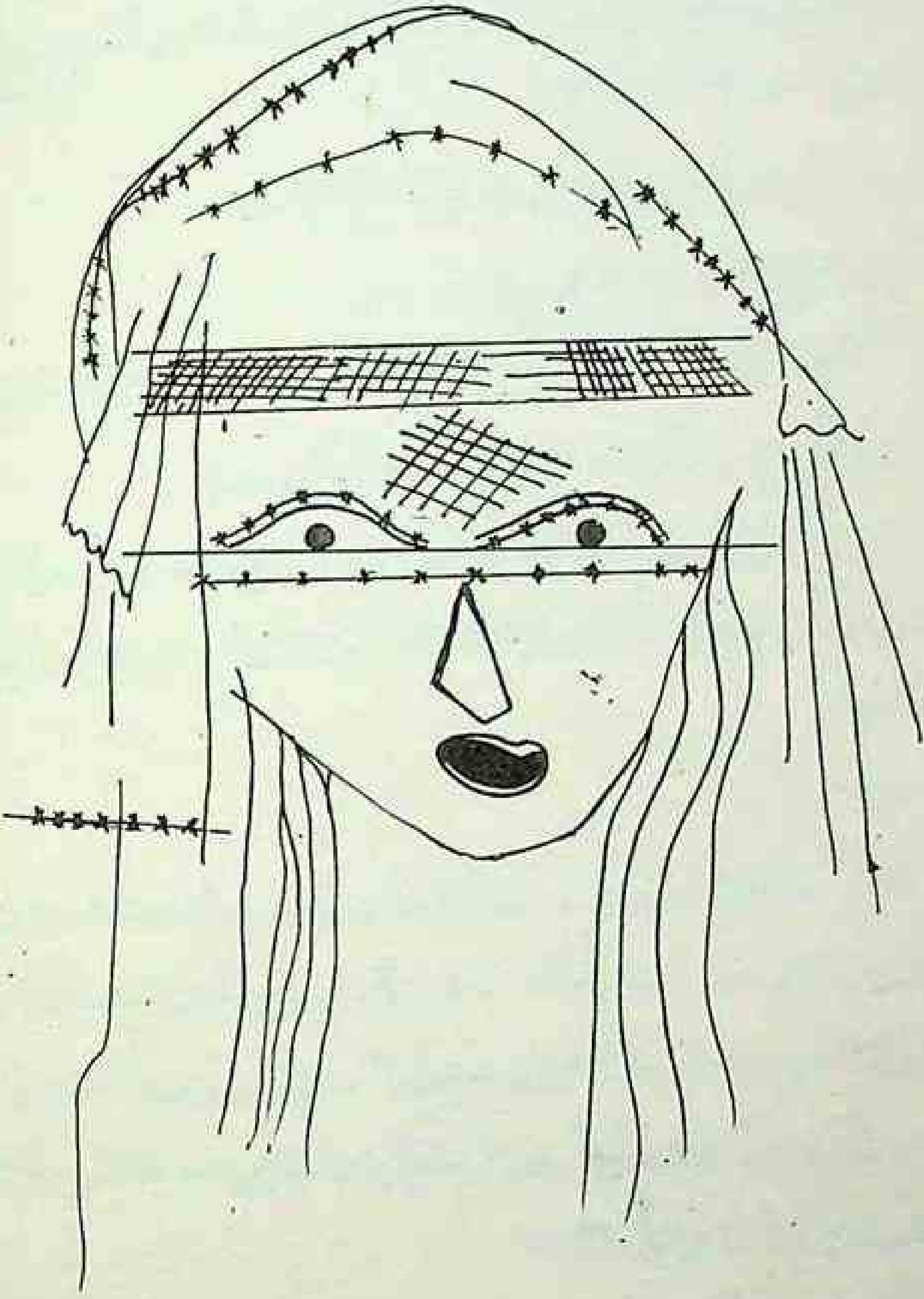
— ماں۔

چھتوں سے بھاری زنجیروں کے ساتھ لٹکتے روشن، بڑے سے بڑے زلزلوں میں ساکت فانوسوں میں زلزلہ لے آنے والی تنہا آواز، سارے شہر میں رچی ساکت تاریک فضا کو کھڑکی سے باہر لاتعداد مشعلوں کے تیز دھار شعلوں سے چیرتی، شہر کے زخموں میں بازگشت بن جاتی ہے۔

حریت کی دیوی کے مجسمے کی نوجوان مغرور چھاتیوں کے عین وسط سے تڑپ کر نکلتی' زمانوں کی فضاؤں کو چیرتی تنہا سی گل کی کرلاٹ،

— ماآآآں ں ں ں۔

گنگرین
مِرگی
ریبیز



گنگرین

یہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے؟

لوگ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھنے کے بعد دم سادھ کر ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال کرتے ہیں، نظروں ہی نظروں میں، ایک دوسرے سے مبہم سا خوف زدہ، اجنبی جواب پاکر اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو جاتے ہیں اور ان کے سائے سر جھکائے بہت ہی آہستہ رو، جیسے وقت، پانی کا آبشار نہیں بلکہ موبل آئل کا دھارا ہے، بہت بے دلی سے، میکانکی انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے سوا چارہ نہیں کہ چکنی سی تاریکی نے ان کے وجود ساکت کر کے ان کے سائے الگ کر دیئے ہیں۔

وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑا آسمان کو دیکھتا ہے۔ بادل، بڑے بڑے، مہیب بادل، چاروں اور تا حدِ نگاہ، تیز ہواؤں کے تھپیڑے کھاتے ایک دوسرے میں گم ہو کر ابھرتے ہوئے، چاروں اور پھیلتے، سمٹتے ہوئے، ایک دوسرے سے ٹکرا کر اوپر کو اٹھتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے آخر میں، غیر جانبدار ملک ناروے کو جب غیر ممالک سے موسم کے بارے میں پیش گوئیاں موصول ہونا بند ہو گئیں تو ناروے کے ماہرینِ موسمیات نے موسم کی پیش گوئی کے لئے اس مفروضے پر نیا طریقہ ایجاد کیا کہ موسم، ہواؤں کے جھگڑوں کی حرکات سے جنم لیتا ہے، جہاں ہواؤں کا اتصال و تصادم ہوتا ہے، اس جگہ کو ان ماہرین نے جنگی اصطلاح کے مطابق، کہ اس وقت پہلی جنگِ عظیم جاری تھی، فرنٹ یعنی محاذ کا نام دیا۔ اس فرنٹ پر اس اتصال و

تصادم کا اثر مختصر لیکن اتنا شدید ہوتا ہے کہ گرم ہوائیں آسمانوں کو اٹھتی ہیں اور سرد ہوائیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ تب فرنٹ کی کوکھ سے سرکش طوفانی عفریت دیوانہ وار نکلتے ہیں اور اپنے ہاتھیوں میں بجلیاں تھامے، دامن میں ہری کین، ٹائیفون، سائیکلون یا تورنادو چھپائے، ساحلوں، سمندروں اور ریداگوں پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

—— یہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے؟

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا اپنے کمرے میں آتا ہے جہاں اس کی بیوی اپنے ابھرے ہوئے پیٹ کو تھامے چارپائی پر حیران و پریشان بیٹھی ہے۔ سایہ، سائے پر سوال داغتا ہے۔

—— آج مرغوں نے اذانیں دی تھیں؟ پرندے چہچہائے تھے؟

اس کی بیوی آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر سر جھکا لیتی ہے۔ کہتی ہے۔

—— آج دن پورے ہو گئے ہیں۔

—— نہیں، نہیں، سورج نہیں نکلا —— سورج نہیں نکلا ——

وہ پھر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا، واپس چھت پر آ جاتا ہے۔ مشرق کی جانب دیکھتا ہے۔

—— تو سورج واقعی نہیں نکلا؟

وہ ہر صبح خود چھت پر جا کر طلوعِ آفتاب دیکھتا ہے کہ جب اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس نے سنا تھا اور جب پڑھنے کے قابل ہوا تھا، اس نے پڑھا تھا اور جب وہ سمجھنے کے قابل ہوا تھا کہ دورِ دراز کی بعض زمینوں پر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی پہلی کرنیں وہاں کے انسانوں میں زندگی کا روپ دھارتی ہیں اور جب سورج اپنی کرنوں سے بندھا افق سے ابھرتا ہے تو انسان کا سہرا تقدیر بن کر اس کے سارے آسمان، اس کی ساری زمین، اس کے سارے وجود میں پھیل جاتا ہے کہ سائے اور وجود کا تضاد مٹ جاتا ہے۔

وہ ہر صبح خود چھت پر جا کر اس خواہش میں اپنے آسمان، اپنی زمین، اپنے وجود کو سورج کی کرنوں کے حوالے کرتا ہے لیکن ہر صبح جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے، جب سے اس نے سنا ہے، جب سے اس نے پڑھا ہے، جب سے اس نے سمجھا ہے، ٹھٹھری ہوئی

بانجھ کرنیں وہیں کہیں بیمار زرد سورج کے قریب لڑکھڑا کے گر جاتی ہیں۔ اس وقت سورج کے گول دائرے کے ارد گرد چھوٹی چھوٹی سیاہ بدلیاں پھیل جاتی ہیں زرد اور ہلکے نارنجی رنگ سیاہی میں گھل کر سورج کے دائرے کو گڈمڈ کر کے پھیلا دیتے ہیں اور سورج کچھ ایسی شکل اختیار کر لیتا ہے جیسے ان سب کی سانجھ بھینس کی دم پر وہ ناسور، جس کے بارے میں اس نے ماہرین کی زبانی سنا تھا کہ گینگرین ہے۔

وہ چھت پر پہنچتے ہی پلٹ کر تاریک سیڑھیوں کو دیکھتا ہے۔ نظریں سیڑھیوں کی تاریکی چاٹتی کمرے میں داخل ہوتی ہیں اور بیوی کے پھولے ہوئے پیٹ کے زرد، ہلکے نارنجی رنگ میں سیاہی گھول دیتی ہیں۔

گینگرین!

آج دن پورے ہو گئے ہیں۔

نہیں نہیں سورج

وہ سورج جو اپنی کرنوں سے بندھا مشرق سے ابھرتا ہے تو انسان کا سنہرا مقدر بن کر اس کے آسمان، اس کی زمین، اس کے وجود میں پھیل جاتا ہے کر سائے اور وجود کا تضاد مٹ جاتا ہے جس کے بارے میں مقامی محکمہ موسمیات کے ماہرین نے اخبار، ریڈیو، ٹیلیویژن کے ذریعے صدیوں پرانی بشارت کو اپنی پیش گوئی کے طور پر مشتہر کروایا تھا۔

لیکن وہ سورج ہے کہاں، کیا حسب معمول محکمہ موسمیات کی پیش گوئی الٹ ثابت ہو گی لیکن یہ تو بشارتوں کا نوشتہ ہے، اگرچہ ان میں وقت کا اندراج نہیں لیکن پھر بھی، پھر بھی۔

یہ راتوں رات کیا ہو گیا ہے؟

وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔

اب وہ مہیب سرکش عفریت CUMUNOLIMBUS بادلوں کو سمیٹ کر کے غائب ہو گئے ہیں۔ ان بادلوں کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ پیدا تو ٹراپیکل سمندروں میں ہوتے ہیں لیکن ان کی یلغار ساحلی اور میدانی علاقوں پر یکساں ہوتی ہے۔ یہ بادل ہر دم نئی شکلیں اختیار کرتے بجلیوں کے کوڑے برساتے، بارش اور اولوں کی بوچھاڑ کرتے، ہریکین نامی مست

وندلتے پھرتے ہیں۔ بعض علاقوں میں ہریکین کو ٹائیفون یا سائیکلون بھی کہا جاتا ہے اور خاص حالات میں تورنادو بھی —— جب اس طوفان کے قیف نما ستون زمین پر اترنے لگتے ہیں۔

اس ہری کین، ٹائیفون، سائیکلون بالخاص حالات میں تورنادو کی ایک آنکھ بھی ہوتی ہے، اس کے مرکز میں، بہت پرسکون کہ دن کے وقت سورج اور رات کے وقت تارے صاف نظر آتے ہیں۔ اس آنکھ تک پہنچنے کے لئے اس کے گرد بے پناہ قوت سے گھومتے، سکڑتے، پھیلتے، ابھرتے، ڈوبتے بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں کو پار کرنا پڑتا ہے۔

ان سرکش بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں میں تھپیڑے کھاتی، ابھرتی ڈوبتی اس کی آنکھیں ہری کین کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھتی ہیں۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ مہیب سرکش عفریت جن کی جگہ کیموفلبس بادلوں نے لے لی تھی، غائب نہیں ہوئے بلکہ اطمینان سے اس آنکھ میں بیٹھے، دن میں چمکتا سورج اور رات میں چمکتے تارے دیکھتے ہیں۔ بظاہر تو ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن دھیان ان کا ان طوفانی بادلوں پر ہے جو ان کے ابروؤں سے بندھے ابروؤں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

اس کی آنکھیں، طوفان کی اس صورت کا راز پاکر اسی طرح دھاڑتے، چنگھاڑتے، بل کھاتے سرکش بادلوں، ہواؤں اور بجلیوں کے تھپیڑے کھاتی پلٹ کر اس کے گھر کی چھت کے بائیں کونے میں لگی کبوتروں کی چھتری پر اترتی ہیں اور چھتری کے بانس سے اتر کے پاس بیٹھے کبوتروں پر جا پڑتی ہیں۔ وہ بڑھ کر اپنا سب سے قابل اعتماد کبوتر اٹھاتا ہے، اس کا سر چومتا ہے اور فضا میں چھوڑ دیتا ہے کہ سورج کے طلوع ہونے کی خبر لائے۔ کبوتر پھڑپھڑا کے اوپر کو اٹھتا ہے اور مکانوں کی چھتوں پر متوازی پرواز کرتا ہوا مشرق کی جانب غائب ہو جاتا ہے۔

اب فضا تاریکی سے بہت بوجھل ہو جاتی ہے۔

وہ چھت کی منڈیر کے ساتھ ٹیک لگا کے پھر آسمان کا جائزہ لیتا ہے۔ اب بادل مسخ شکلیں اختیار کرنے لگتے ہیں کہ اس کی بیوی کی آواز اس کے کانوں میں آتی ہے۔

وہ آسمان سے نظریں نہیں ہٹانا چاہتا۔

بیوی اسے پھر پکارتی ہے، التجا بھرے لہجے میں۔

کیا مصیبت ہے

وہ جھنجھلا کے سیڑھیوں کی جانب آتا ہے۔ دیواروں کو تاریکی میں ٹٹولتا، سیڑھیاں اترتا ہے۔ کمرے میں پہنچتا ہے۔ اس کی نظریں بیوی کے پیٹ پر پڑتی ہیں۔

گینگرین

وہ بہت خوفزدہ ہو کر سرگوشی میں اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

— تمھیں معلوم ہے ابھی بہت سے کوّے آئیں گے اور — اور تمھارے پیٹ —

بیوی ہولے سے کراہتی ہے۔

— مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ دائی کو بلاؤ۔

— مجھے سورج چاہیئے سورج

اس کے لہجے میں بڑی درشتی ہے۔ اس کی بیوی اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیتی ہے۔ بے بس بانجھ غصے میں اس کے خاوند کا چہرہ تمتماتا ہے۔ گھٹتے ہوئے سانس میں اس کی چھپتی ہوئی زبان سے چھتے ہوئے لفظ نکلتے ہیں۔

— اس طوفان، اس نفسانفسی میں جنم لے گا — ؟ کیا جنم لے گا — ؟

اس کی بیوی دھیرے دھیرے رونے لگتی ہے۔ کہتی ہے —

— اس میں میرا کیا قصور ؟

اس میں میرا کیا قصور ؟ وہ اس جملے کو بار بار اپنے ذہن میں دہراتا ہے۔ اس کی بیوی اسے خاموش پارسی سہمی نگاہوں سے پلٹ کر اسے دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تناؤ کو رفتہ رفتہ ڈھیلا پڑتا دیکھ کر کہتی ہے۔

— دائی نے تو وعدہ کیا تھا کہ آجائے گی۔ ابھی تک آئی نہیں۔

اس کی بیوی کے جسم پر رینگتا کرب اس کے اپنے وجود پر طاری ہو جاتا ہے۔ وہ روبوٹ کی طرح اپنی بیوی کی طرف بڑھتا ہے۔ پھولا ہوا پیٹ جس کے زرد اور ہلکے نارنجی رنگ میں سیاہی گھلتی نظر آتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی طرف اٹھتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس کی ناف پر بوسہ

دیتا ہے اور تیزی سے مڑ کر باہر کے دروازے کی طرف جاتا ہے۔

—— میں باہر دیکھتا ہوں، شاید آ رہی ہو۔

وہ گھر کے دروازے سے نکل کر باہر بازار میں آ کے کھڑا ہو جاتا ہے۔

ہوا جو گلیوں، بازاروں اور شاہراہوں میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی اب ذرا تیز ہو جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ آسمان پر نظریں ڈال کر ڈرتے ڈرتے ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور نظروں نظروں میں ایک دوسرے سے مبہم سا جواب پا کر اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو جاتے ہیں اور ان کے سائے سر جھکائے بہت ہی آہستہ رو، جیسے وقت پانی کا آبشار نہیں بلکہ سوپ آئل کا دھارا ہے، بہت بے دلی سے میکانکی انداز میں اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

اب تیز ہوا میں، سڑک پہ اڑتا ہوا اخبار کا ایک صفحہ آ کر اس کے پیروں سے لپٹ جاتا ہے۔ وہ جھک کر اخبار کے اس صفحے کو اٹھاتا ہے، پڑھتا ہے۔ نیم تاریکی میں اخبار کی سرخی چمکتی ہے —— بھینس کی گینگرین —— ماہرین نے علاج ڈھونڈ لیا۔ پھر خبر کی تاریخ، مقام ابھرا اور کچھ اس مفہوم کی عبارت کہ وہ بھینس جو ان سب کی سانجھ بھینس تھی کہ جس کی دم پر مدتوں سے گینگرین تھی۔ عجیب گینگرین تھی کہ جس کے زہر سے بھینس مرتی تھی نہ صحیح معنوں میں زندہ ہی تھی اور جس کے زخم سے گوشت کے ریشے اڑانے کی خاطر پیپ کی پروا نہ کرتے ہوئے، کوے، لاتعداد گوشت خور کوے شور مچا مچا کر ٹھونگے مارا کرتے تھے۔ آپس میں لڑا کرتے تھے۔ بھینس کو اذیت میں مبتلا کر دیا کرتے تھے۔ اس کا علاج ماہرین نے یہ کیا ہے کہ ان میں سے ایک کوے کو مار کے بھینس کی دم پر لٹکا دیا گیا ہے۔ اب میلوں دور تک کوؤں کا نشان نہیں۔ اب بھینس کوؤں کے کچوکوں سے آزاد ہے۔

لیکن گینگرین کا عذاب ——

وہ خود سے سوال کر کے اخبار کو دونوں ہاتھوں سے مروڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اخبار کا کاغذ گیند بنا تیز ہوا میں گھومتا آگے بڑھ جاتا ہے۔

تب اس کی آنکھیں یکدم چندھیا جاتی ہیں۔ بجلی کا لشکارا دم بھر میں ساری کائنات کو

اندھا کر کے بادلوں کی کروٹوں میں چلا جاتا ہے۔ پھر گرج، گرج کی بازگشت جیسے کئی لاکھ ٹی این ٹی پھٹ گئے ہیں۔

اب فرنٹ پر ہواؤں کے اتصال اور تصادم کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ کیمولو نمبس بادل، ہری کیبن کی پر سکون آنکھ میں بیٹھے عفریتوں کے ابروؤں سے بندھے واضح صورتیں اختیار کرنے لگتے ہیں۔ جنگلوں کی صورت، سجدہ ریز انسانوں کی صورت، منہ پھاڑ کر دہاڑتے ہوئے شیروں کی صورت، بھیڑوں کے پیچھے بھاگتے بھیڑیوں کی صورت۔ بجلی کا کوندا لپکتا ہے تو جنگلوں میں آگ برستی ہے۔ کیا حیوان، کیا انسان سب کے سب بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر گرج، گرج کی بازگشت کو تیز طوفانی ہوائیں، اپنے شکنجے میں کس کے زمین پر وار کرتی ہیں۔ لوگوں کے ساکت وجودوں پر لباس پھٹے ہوئے پرچموں کی طرح پھڑ پھڑاتے ہیں اور ان کے سائے ان کے وجودوں سے نکل کر چپ چاپ سر جھکائے بہت اداس، بہت بے دلی، بہت دکھ سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

وادی بازار کے نکڑ سے برآمد ہو کر اسے ذو معنی نگاہوں سے دیکھتی، اس کے قریب سے گذر کر اس کے گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ اس کا دھیان گلیوں، بازاروں میں دندناتی ہوا، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں پر سیاہ گرزوں سے حملہ آور ہوا کے وار سہتا ہے کہ اب آسمان پر تمام صورتیں لپکتی بجلیوں میں بھسم ہو کر گہری خاکی، سیاہی مائل خاکی چادر کی صورت تننے لگتی ہیں۔

وجودوں کے سایوں اور سایوں کے وجودوں کی اوٹ سے، صاف و شفاف سفید قمیص پتلون پہنے ایک آدمی نکلتا ہے۔ بہت تیکھا، بہت سمارٹ۔ اس نے ایک کندھے سے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر لٹکا رکھا ہے۔ دوسرے کندھے سے موری کیمرہ اور فلیش گن، گلے میں ساکت تصاویر کھینچنے والا کیمرہ اور ایک ہاتھ میں مائیکروفون۔ وہ وجودوں کو ساکت پا کر سایوں سے پوچھتا ہے۔

— آپ کا موسم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

سب اپنی اپنی بولیوں میں کہتے ہیں۔

—— ہم جب اٹھے تھے تو رستم کو ایسا ہی پایا۔ ہم بے تصور ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ راتوں رات یہ کیا ہو گیا ہے؟

—— سوال میں کروں گا آپ نہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ رستم ——

—— ہم خوش ہیں، دیکھئے ہم مسکرا رہے ہیں۔

سفید پوش مائیکروفون کو ٹیپ ریکارڈر سے لٹکا کر فوراً مووی کیمرہ سنبھالتا ہے اور مسکراہٹوں کو محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتا ہے۔

مسکراہٹیں ہونٹوں سے نہیں، زبان پہ لفظوں کی صورت آئی ہیں اور پھر روشنی تو ہے ہی نہیں، فلم پہ تاریکی کے سوا کس شئے کا عکس ہوگا۔

اتنے میں وہ سفید پوش کیمرے سے فلیش گن کی مدد سے تصاویر اتارنے لگتا ہے۔ فلیش گن سے نکلے روشن گینگریتی دھبے، گیس کے غباروں کی طرح اٹھ کر بادلوں کی سیاہی مائل خاکی چادر کی سلوٹوں میں تڑپتی، کلبلاتی، بین کرتی، معدوم ہوتی صورتوں پر چپک جاتے ہیں۔ اب چادروں اور بجلی کے کوندے لپکتے ہیں، زمین پر برستے ہیں اور دیکھتے دیکھتے بعض چوراہوں میں چند ایک وجود جلتی ہوئی مشعلیں بن جاتے ہیں۔ وہ ان مشعلوں کی روشنی میں سفید پوش کو ان مشعلوں کی تصویر اتارنے کی بجائے، کہ اب تو روشنی ہے، اپنی طرف بڑھتے دیکھتا ہے۔ اس کے قریب آ کر سفید پوش پوچھتا ہے

—— آپ کچھ کہیں گے؟

—— گینگ ری ی ی ی ن

وہ پوری قوت سے چلا کر کہتا ہے اور بھاگ کے اپنے گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ کمرے میں دائی اس کی بیوی کے پیٹ پر جھکی ہے۔ اس کے آنے کی آہٹ پر سر اٹھا کر کہتی ہے۔

—— ابھی کچھ دیر ہے۔

وہ پلٹنے ہی لگتا ہے کہ ایک کتا دم دبائے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اس کتے کا سارا جسم جھنجھناتے ہوئے تار کی طرح لرز رہا ہے۔ کتا اس کی بیوی کی چارپائی کے نیچے گھسنے ہی لگتا ہے کہ اس کی بیوی چلا اٹھتی ہے۔

— اسے نکالو — باہر نکالو —

کتا اس غیر متوقع ردِ عمل کو محسوس کر کے وہیں ایک طرف دیوار کے ساتھ دبک جاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو حیرت سے سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ بیوی ہذیانی کیفیت میں چلائے جاتی ہے

— اسے باہر نکالو — باہر نکالو —

— رہنے دو، باہر موسم بہت خراب ہے۔

وہ چلائے جاتی ہے۔ چارپائی پر سمٹ سمٹ کر اس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔

— دیوانی ہوئی ہو — بے چارہ پناہ لینے آیا ہے۔

— مجھے نہیں پتا، اسے باہر نکالو — تمھیں میرا ذرا خیال نہیں — نکالو اسے خدا کے لئے

— ورنہ — ورنہ —

بیوی کو یوں دیکھ کر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس کے جسم کا تمام خون اس کے کانوں میں سنسنانے لگتا ہے۔ وہ دیوانہ وار پیر کا جوتا اتار کے اس کتے کو پیٹنے لگتا ہے

— نکل یہاں سے حرامزادے — دفع ہو جا —

جوتا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ کتے کو ٹھوکریں مارنے لگتا ہے۔ کتا اتنا بوکھلا جاتا ہے کہ اسے باہر جانے کا راستہ بھی نظر نہیں آتا۔ وہ کتے کو ٹھوکریں مارتا دروازے کی طرف دھکیلتا ہے۔

— نکل، نکل یہاں سے، کتے، حرامزادے۔

کتا ٹھوکریں کھاتا۔ دم دبائے آہستہ آہستہ کھسکتا دروازے تک جا پہنچتا ہے۔ پلٹ کر چیوں چیوں کرتا اس کی طرف دیکھتا ہے بے بسی، بیچارگی، مظلومیت اور حسرت میں ڈوبی، اس کی اپنی آنکھیں کتے کی کھوپڑی سے اسے گھورتی ہیں۔ ان آنکھوں میں زرد ہلکے نارنجی رنگوں میں سیاہی گھل جاتی ہے۔

— گینگرین !

وہ چیختا ہے۔ کتے کو آخری ٹھوکر مار کے دروازے سے باہر نکال کر کنڈی لگا دیتا ہے اور دیوانہ وار پلٹ کر دو دو چار چار سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر آجاتا ہے۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ

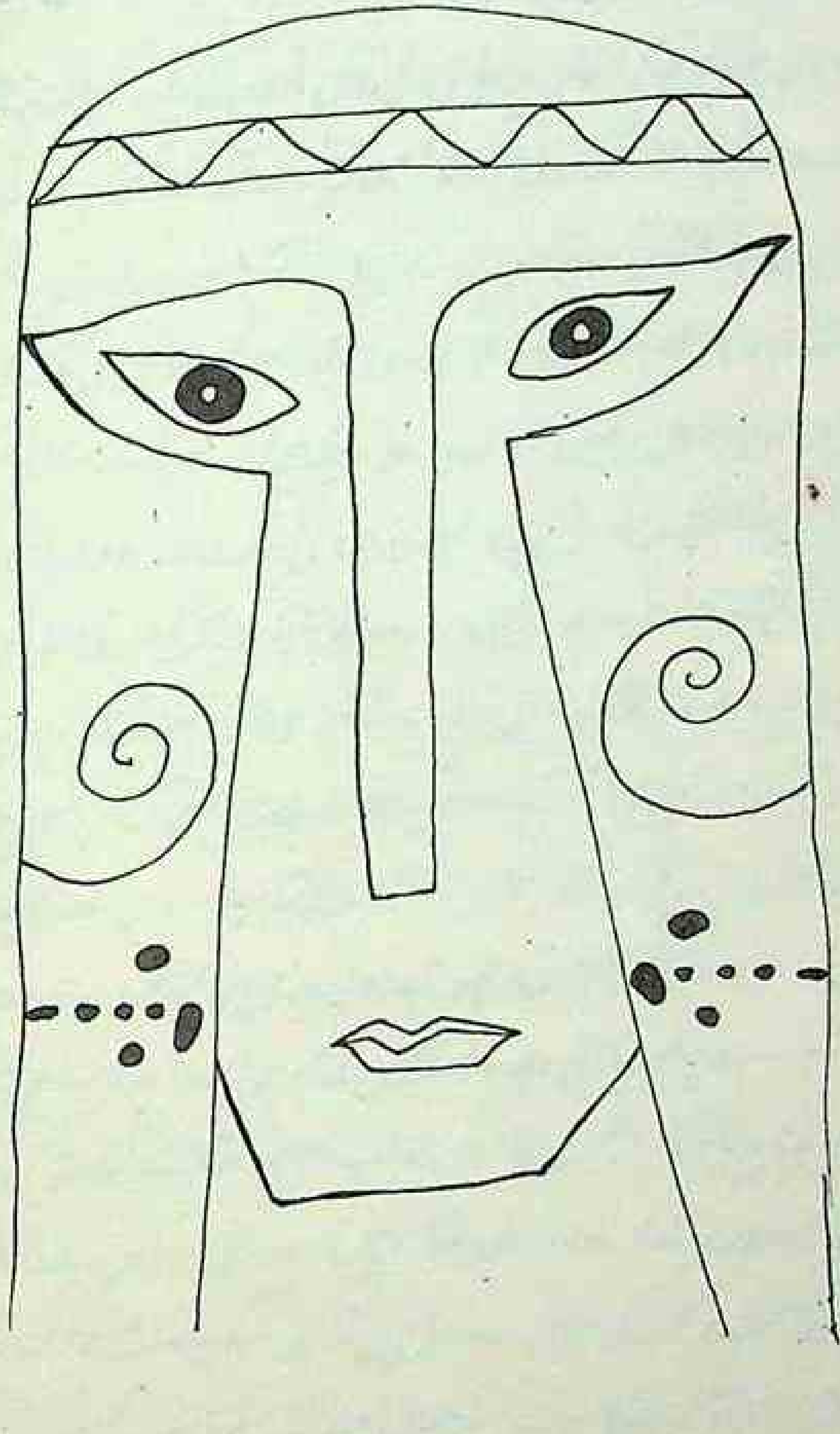
بری طرح تشنج میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ پٹھوں کی ڈھیل اور تناؤ کی ردم بری ہے جو جو راہوں میں بھڑکتی مشعلوں کی

وہ اپنے تشنج پر قابو پانے کی کوشش میں بار بار مشرق کی سمت دیکھتا ہے ۔ جس سمت سے اس کے بھیجے ہوئے کبوتر کو لوٹنا ہے ۔

اب یوں ہوتا ہے کہ آسمان پر سیاہی مائل خاکی بادلوں کی چادر مکمل طور پر تنتے ہی یہ چادر مختلف جگہوں سے قیف نما ستونوں کی صورت زمین کی طرف اترنے لگتی ہے ۔ اسے ماہرین تورنادو کہتے ہیں ۔ زمین سے اٹھ کر آسمان کو جانے کے بجائے آسمان سے زمین پر اترنے والے ان داوردوں کے اندر ہوا کا دباؤ صفر بلکہ منفی ہوتا ہے اور باہر کئی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر کھاتی ہوائیں جہاں جہاں یہ قیف نما داوردے اترتے ہیں بڑے بڑے سکائی سکریپروں کو اپنے اپنے لے کر خس و خاشاک بنا دیتے ہیں ۔ ایک ایسے ہی داوردے کو وہ اپنے کبوتروں کی چھتری کے عین اوپر دیکھتا ہے ۔ غور سے دیکھنے پر اسے پتا چلتا ہے کہ قیف کی نالی کی طرح اس کا سرا نہیں بلکہ بند ہے ۔ اسے یکایک خیال آتا ہے کہ اگر کسی طرح قیف کے بند سرے کو وہیں روک دیا جائے تو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے وہ کچھ اور سوچے بغیر بھاگ کر بانس پر چڑھتا ہے اور ڈولتی ہوئی چھتری پر پہنچ کر بڑی مشکل سے متوازن ہوتا ہے ۔ اس سے پیشتر کہ داوردے کی قیف کا بند سرا کبوتروں کی چھتری کو چھوئے وہ اسے اپنے کندھوں کے درمیان پشت پر روک لیتا ہے ۔ بے پناہ دباؤ کی وجہ سے اس کے جسم کا ایک ایک مسام پھٹنے لگتا ہے لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر اٹلیس بنا، اس عذاب کا بوجھ اٹھائے گرد و پیش کو دیکھتا ہے جہاں کہیں داوردوں کے آنے کا امکان تھا، وہیں اسے وجود اٹلیس بنے نظر آتے ہیں ۔ وہ پھر مشرق کی سمت دیکھنے کی غرض سے نظریں پلٹتے ہی لگتا ہے کہ عین اس وقت نوزائیدہ بچے کے پہلے سانس، پنچھوں کی صورت، سیڑھیاں پھلانگتے، طوفان کی گھن گرج کو چیرتے اس کے کانوں تک پہنچتے ہیں ۔ اس کی نظریں لمحہ بھر کے لئے سیڑھیوں کی تاریکی میں رکتی ہیں پھر فوراً مشرق کی طرف اٹھ جاتی ہیں ۔

اس کی آنکھیں مشرق میں گڑی ہیں ۔ طوفانوں، ہری کینوں، ٹائیفونوں، سائیکلونوں

تورناروں کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے، وہ کبوتروں کی چھتری پر متوازن کھڑا ہے کہ ابھی تک چالیس دن، چالیس راتیں نہیں گزریں کہ اس کا بھیجا ہوا کبوتر اپنی چونچ میں سورج کی پہلی کرن لے کر آئے اور اسے اپنے افق پر اس سورج کے طلوع ہونے کی خبر دے، جو انسان کا سنہرا مقدر بن کر اس کے سارے آسمان، اس کی ساری زمین، اس کے سارے وجود میں پھیل جاتا ہے۔



مِرگی*

جب اس کی آنکھیں کھلتی ہیں تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔
وہ آنکھیں مل کر کرنوں کے برہنہ آئینوں میں چاروں اور دیکھتا ہے۔
سکڑی ہوئی ہتیلیوں میں شیشے کی کرچیاں ہیں۔ اس کی نظریں سمندر کے کنارے بھاگتے چھوٹے چھوٹے کیکڑوں کے پیروں میں الجھ الجھ کر کٹنے ٹوٹنے لگتی ہیں۔

تو پھر مجھے دورہ پڑا؟
وہ اپنے ٹوٹتے ہوئے جسم کو کانپتے گھٹنوں پر سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کیا ہوا تھا؟
وہ ٹرام میں بیٹھا ہے۔ ٹرام کسی سے ٹکرا جاتی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ کوئی ٹرام کے نیچے آگیا ہے۔ ٹرام رک جاتی ہے۔ چند ایک متجسس لوگوں کی گردنیں کھڑکیوں سے باہر جھانکتی ہیں۔ ٹرام کے سارے مسافر نیچے اتر جاتے ہیں اور تیز تیز قدموں سے بس سٹاپ کی طرف بڑھ جاتے ہیں کہ انہیں پہلے ہی دفتر سے دیر ہو چکی ہے۔ سڑک کے درمیان ٹرام کی پٹڑیوں پر ٹریفک رک جاتی ہے۔ رکی ٹرام کے دائیں بائیں گزرتی بسوں، کاروں، رکشوں کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔
کیا مصیبت ہے، پہلے ہی دفتر سے دیر ہو گئی ہے، اب جانے بس میں جگہ بھی ملتی ہے یا نہیں۔

وہ ٹرام سے اتر کر آگے کو بڑھتا ہے۔
اس کی نظریں غیر ارادی طور پر ٹرام کے اگلے پہیوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں جن کے آگے

---

* EPILEPSY

ایک بہت خوبصورت گجری کچلی پڑی ہے۔ اس کا خون اس کی دلتوہی سے بہتے دودھ میں پگڈنڈیاں بناتا ٹرک اور پٹڑی کے اتصال پر جم رہا ہے، اس اتصال سے بہہ کر فٹ پاتھ کی جانب رواں ہے۔ گجری کی چھاتیاں پھٹے ہوئے گریبان میں تڑخ گئی ہیں۔ پاس کنڈکٹر، ڈرائیور اور دو سپاہی کھڑے ہیں۔ رکشا، بسیں، موٹریں، لوگ اس طرف دھیان دیئے بغیر اپنے آپ میں مگن اپنی اپنی خواہشوں کا پیچھا کرتے آجا رہے ہیں۔

وہ ایک لحظہ بھی رکے بغیر سیدھا دفتر کو چل دیتا ہے کہ اسے پہلے ہی دیر ہو گئی ہے، بس کا انتظار کیئے بغیر کہ جانے بس میں جگہ ملے نہ ملے۔

نہیں، یہ اس واقعے کا اثر نہیں کہ یہ واقعہ، حادثہ نہیں کہ جب حادثے معمول بن جاتے ہیں تو واقعے کہلاتے ہیں، بہت ہی معمولی نوعیت کا تھا۔

تو پھر؟

دفتر میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔ مشینوں میں پرزے ڈھل ڈھل کر نکلتے ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنی شفٹ کا دورہ کرتا ہے۔ اور کمرے میں آ کر مصروف ہو جاتا ہے۔ چائے کے دوسرے دور میں پورا اخبار پڑھ لیتا ہے اور تیسرے دور میں ناول کا ایک باب بھی جسے وہ اپنی میز کے سب سے نچلے دراز میں مقفل رکھتا ہے۔

گویا یہ دن بھی دوسرے دنوں کی کاربن کاپی ہے۔

تو آج پھر یہ دورہ کیوں پڑا؟

وہ تمام دن بالکل ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔ اس کے مالک نے اس کے کام سے خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا ہے، جس سے اس کی شادی کے امکانات روشن ہو گئے ہیں ــــ وہ خوش ہے کہ اب وہ عنقریب سیٹل ہو جائے گا۔

لیکن پھر یہ اسے کیا ہو جاتا ہے، وہ سوچتا ہے۔

وہ قریب سے بھاگتے چھوٹے سے کیکڑے کی پیٹھ پر مکا مار کے ریت میں گاڑ دیتا ہے۔ اس کے جسم میں کمانیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔

اچھا بھلا دن گذر رہا ہے کہ بیٹھے بٹھائے جانے اسے کیا ہو جاتا ہے کہ آنکھوں کی

پنڈلیوں میں زلزلہ آجاتا ہے۔ اس کا وجود ٹوٹی پھوٹی کائنات کے ملبے کے نیچے دب کر اینٹھنے لگتا ہے اور جب اس کا احساس لوٹتا ہے تو خود کو کرنوں کی انی پر تڑپتا پاتا ہے۔

—— کیوں؟

وہ چیختا اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور گرتا پڑتا سمندر کے کنارے بھاگنے لگتا ہے، پیروں میں پڑتی سمندر کی زنجیروں کو توڑتا ہوا، ہانپتا ہوا۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ بہت زور سے چیخے۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ مارتا ہے جو سمندر کی چیختی چپ میں ڈوب جاتی ہے اسی لئے اسے اپنی چیخ کی آواز سنائی نہیں دیتی تو وہ اسی شدت سے ہنستا ہے جس شدت سے چیخا تھا۔

—— میں ہنسا ہوں؟

وہ خود سے پوچھتا ہے۔

ننھی منی تارا مچھلیاں اور چھوٹے چھوٹے گھونگے سمندر کی طرف بڑھتے، اڑتی لہر کا سواگت کرتے ہیں۔ پانی کی چنگھاڑتی ڈائن سمندر سے اٹھتی، چٹانوں کو پھنکار سے اڑاتی اس کے جسم میں روئی کے دانت گاڑ کے بلبلوں میں پھوٹ بہتی ہے۔ وہ بھاگتا بھاگتا رک جاتا ہے اور غصے میں بلبلوں کو ٹھوکریں مارنے لگتا ہے۔

—— تم کیوں چپ ہو؟

پانی کی ڈائن پھر اٹھتی ہے، باہوں کی پھانسی لئے اس کی طرف بڑھتی ہے، اس کا سانس چھین کر اسے گیلی ریت پر اچھال دیتی ہے۔

مجھے چوٹ نہیں لگی۔ کوئی زخم نہیں، کیوں؟ وہ سوچتا ہے، مڑ کر سمندر کو دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں طیش ہے اور بے بسی بھی۔

—— دیکھا، میں نے پہلے ہی کہا تھا۔

وہ خود سے کہتا ہے۔

—— کہ یہ دورہ مجھ میں نہیں ہے میرے اردگرد ہے، میں اس کے اندر ہوں۔

وہ ہوا سے سانس چھینتا ہے اور چلو میں ریت بھر کے بدن پر ملتا ہے۔

—— یہ میرا زخم ہے۔ یہ زخم پھیل کر میرا جسم بن گیا ہے۔ یہ زخم بے حس ہے کہ نمکین سمندری ہواؤں کے باوجود کوئی جلن نہیں، جلن کیوں نہیں ؟

وہ اپنے جسم سے نظریں اٹھا کر آسمان پر جما دیتا ہے۔

پھیکے سے آسمان سے پرانے زخموں کی سڑاند آتی ہے۔ اس کی ناک کی پھننگیں پھیلنے لگتی ہیں۔

اس کے پیر پر سنہری چیونٹی کاٹتی ہے۔ وہ بلبلا اٹھتا ہے۔

تو یہ میرا پیر ہے ؟ وہ سر جھکا کر اپنے پیر کو دیکھتا ہے ؛ چیونٹی کو وہیں مسل دیتا ہے۔ پھر دوسری چیونٹی، تیسری، چوتھی، اس کے جسم کے سُوت سُوت میں برچھیاں کھب جاتی ہیں۔ جسم کا ریشہ ریشہ تن جاتا ہے۔ درد کے مارے اس کے منہ سے جھاگ کے بلبلے پھوٹ پڑتے ہیں۔ وہ کراہتا ہے۔

—— میرا یہ شکنجہ کب ڈھیلا ہوگا ؟

دور سے آواز آتی ہے۔

ہوا کی سرسراہٹ ؟ درختوں کی سرگوشی ؟ سانپ کی پھنکار ؟ پرندے کی سیٹی ؟ یہ آواز کیسی ہے ؟

مجھے آواز آتی تھی۔

وہ ہوا کا گھونٹ بھر کے حلق میں کھلتی کانوں کی نالیوں میں اتار دیتا ہے جس سے کانوں کے پردے ٹک کر کے کھل جاتے ہیں۔

سُر ؟ ہوا اپنے کاندھوں پر سُروں کو بٹھا کے لائی ہے۔

اس کے کئی ریشے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ سُر اس کے کانوں پر ایڑیاں مارتے ہیں ؛ نغموں کے چشمے پھوٹ بہتے ہیں اور اس کا سارا تناؤ گھل جاتا ہے۔ منہ میں جمع ہوتا اذیت کا جھاگ خشک ہو جاتا ہے۔

مجھے اس گیت کی آواز آ رہی ہے۔ میں یہ آواز اس لئے سن رہا ہوں کہ میں بھی آواز کے سمندر کی ایک لہر ہوں۔

وہ چٹان کی اوٹ میں ٹھنڈی گیلی ریت پر سیدھا لیٹ جاتا ہے۔ بھیگی بھیگی ریت کا ایتھر اس کے ہر خلیے میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہر ہنستی کھیلتی لہر اگلی لہر کو پھلانگتی چٹان سے ٹکرا کے پھوار کی صورت اس پر بکھر جاتی ہے۔

وہ آنکھیں موند لیتا ہے، جیسے موت کے سکون میں پہلا قدم رکھ دیتا ہے۔

— تم اپنا علاج کراؤ۔ تم ایسا محنتی اور قابل جوان ہو۔

کئی دفعہ دھوپ آسمان سے اتر کے اونچی اونچی عمارتوں کی سب سے آخری اینٹ سے پھسل کر اس کے حلق میں ٹپکی ہے اور کانٹا بن کر اس کے تالو میں یوں پھنس جاتی رہی ہے جیسے مچھلی پکڑنے والا کانٹا۔ جب بھی اس کانٹے کی ڈوری ہلتی ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود ہے تو سہی، پر ڈوری کی جڑیں کہاں ہیں؟

ڈوری، جڑیں، دھوپ، عمارتیں، مشینیں، پرزے، لفظ لفظ،

سیاہ لفظ جو سفید کاغذ پر اتر کے سفید ہو جاتے ہیں۔ سفید لفظ جو سیاہ سلیٹ پر اتر کے سیاہ ہو جاتے ہیں، یوں لفظ کا مطلب روپوش ہو جاتا ہے اور لفظوں، ناموں کے ساتھ تمام اشیاء کا مقصد بھی۔ صدیوں سے انسان نے حوالوں سے اشیاء کو شناخت کرنے کی کوشش کی ہے، جاننا چاہا ہے پر سوچ کے لاروے ہمیشہ سے کربل کربل کرتے رہے ہیں۔ ان کے پر آج تک نہیں نکلے۔

— تم میں اچھی خاصی تخلیقی صلاحیتیں ہیں۔ اگر ذرا توجہ کرو تو نئے جنریٹروں کے ڈیزائن

پر سر، لاروؤں کی کربلاہٹ سے مجھے خوف آتا ہے۔ تو بھی میں کبھی اس گراری کے دانت میں آتا ہوں اور کبھی اس گراری کے دانت میں، نہیں یہ دانت تو نہیں، یہ تو موت کے سکوت کی مسلسل داب ہے، جو لمحوں میں منقسم ہے۔

— آپ نے درست فرمایا سر، بالکل، میں ضرور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو آپ کے لئے بروئے کار لاؤں گا۔ اور میں بالکل ٹھیک ہوں سر، بس کبھی کبھی ذرا، جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے۔

نہیں، یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔

اس کے سن چہرے پر حرارت کے چٹاخ پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کے روزنوں سے دیکھتا ہے،

چٹان کا سایہ، آسمان کی نیلی چھت، دور، پام اور کھجور کے درخت، ان کے قدموں میں آگ کے پودے، پودوں کے قریب جھونپڑوں کی چھتیں، دور افق پر عمارتوں کی چوٹیاں، مسجدوں کے گنبد، گرجوں کے کلس، ڈوری کی جڑیں،

یہ سب کچھ مجھے پھر کیوں یاد آ گیا ہے۔ اوہ، کسی نے ڈوری ہلائی ہے اور کانٹا، جڑیں کہاں ہیں؟ یہ سب کچھ مجھے محیط کئے ہیں سمندر کی طرح؟ نہیں، یہ سب کچھ، کچھ نہیں ہے۔ صرف میں ہوں؟

کسی نے مجھے پھر چھوا ہے۔

اس کی آنکھوں کے روزن پھر بند ہو جاتے ہیں، وہ کراہتا ہے۔

میں نے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں کی، تو پھر میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے، ساری کائنات میرے ریشے ریشے میں اتر کے تشنج میں کیوں مبتلا ہو جاتی ہے، ساکت ہو جاتی ہے، میری آنکھوں کو الٹا کر میرے دہن سے جھاگ کی صورت کیوں ابلنے لگتی ہے۔

کوئی اس کو سر سے تھام کر پھر ہلاتا ہے۔

—— آنکھیں کھولئے نا۔

وہ پوری آنکھیں کھولتا ہے، اپنے پر جھکا چہرہ دیکھ کر یکدم آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

—— آپ کو کیا ہوا ہے؟

نہیں نہیں

—— آپ چٹان سے ٹکرا گئے تھے؟

نہیں۔

—— آپ آنکھیں کھولئے نا

باریک سی روہانسی آواز۔

مجھے واقعی آواز سنائی دیتی ہے۔ مجھے واقعی کسی نے چھوا ہے۔ مجھے واقعی خوشبو آرہی ہے اور میری آنکھوں میں اس کے چہرے کا عکس بھی ہے۔ میرے جسم سے یہ درد کبھی نکلا بھی تھا؟

وہ بمشکل خود کو سنبھالتا، چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔

وہ لڑکی کی آنکھوں میں دیکھتا ہے جواب اس سے ذرا پرے ہٹ گئی ہے۔

— آپ بے ہوش ہو گئے تھے؟

وہ اسے دیکھے جاتا ہے۔

— ہم، ہم پکنک کے لئے آئے ہیں۔

وہ دور جھونپڑیوں کی اور اشارہ کرتی ہے۔ وہاں سے کیسٹ سے ابھرتے گیتوں کی آواز آتی ہے۔

— میں یونہی تنہا سیر کرتی ادھر آنکلی تھی۔ اور آپ، آپ کو کیا ہو گیا تھا؟

اُف،

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتا ہے۔

— آپ کچھ بتائیں تو۔

مجھے سمندر —

— اگر میڈیکل ایڈ کی ضرورت

کی باتوں نے کھینچ لیا تھا

کاندھوں پر بکھرے سیاہ بال، بڑی بڑی آنکھوں، ستواں ناک اور نازک گلاب کی پنکھڑی ہونٹوں والا کھلتے رنگ کا چہرہ۔ کالی ساڑھی، ہاف بلاؤز جس کے نیچے ابھرا گدرایا گدرایا پیٹ، بغلوں کے بالوں میں اٹکے پسینے کے قطرے اور گہرے کٹاؤ کے گریبان سے جھانکتی، ایک دوسرے سے جڑی انار چھاتیاں۔ اس کی پھسلتی نظروں پر کانٹے اُگ آتے ہیں۔ وہ خشک حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

...ی کتنی مہمل، کتنی بیکار، کتنی پیاسی ہے اور اس کی چھاتیوں میں ٹھاٹھیں مارتا

سمندر ہے۔ ہوا میں لہراتا، کالی ساڑھی کا پلو ناگ کا سر ہے۔ ریت پر کالا ناگ بل کھا رہا ہے۔ اس کے منہ میں ڈالی سے لٹکتا سیب ہے اور مجھے بھوک لگی ہے۔

لڑکی اس کی بے معنی سی نگاہوں میں معنی پا کر لرز سی جاتی ہے۔ خود کو سمیٹتی ہے۔

—— یہ دیکھیے، آپ کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے کتنے ہی کیکڑے ہیں۔

لڑکی پاس پڑی خشک ٹہنی اٹھاتی ہے اور کیکڑوں کو مار بھگاتی ہے۔ کیکڑے بھاگتے ہوئے ساتھ والی دراڑ میں گھس جاتے ہیں۔

یہ، یہ مجھے نوچ کھانا چاہتے تھے۔

—— آپ یہاں تنہا آئے ہیں یا ساتھ میں دوست وغیرہ بھی ہیں۔

تنہا، آپ، دوست، ساتھ، وغیرہ؟ تم مجھے یہ بتاؤ کہ آوازوں کے یہ مختلف نمونے جو تمھاری زبان سے نکل رہے ہیں، کیا ہیں؟ ان کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ میرے سارے رشتے کھو گئے ہیں، میں اپنا عکس کس میں دیکھوں؟ سڑک اور ٹرام کی پٹڑی، سڑک اور فٹ پاتھ کے سنگم پر لہو ملا دودھ بہہ رہا ہے، جم رہا ہے، سانپ کے منہ میں سیب ہے اور سیب کے اندر زہر۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

لڑکی اسے سوچ میں غائب دیکھ کر کہتی ہے۔

—— اب آپ ٹھیک ہیں۔ میں چلتی ہوں۔

اس کے وجود میں کئی ریشے پھڑکتے، تنتے، پھر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔

یہ، یہ آواز کیسی ہے؟ چر یخ چراغ، کھٹ کھٹا کھٹ، ٹھکا ٹھک، چر یخ چراخ۔ ابھی ابھی یہ لڑکی کی آواز ہے؟

وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کالے ناگ کا سر ہوا میں جھومتا ہے۔ لڑکی اسے سہارا دے کر اٹھانے کی غرض سے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ وہ لڑکی کا ہاتھ پکڑتا ہے اور فوراً اپنا ہاتھ چھڑا کر کھینچ لیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ لڑکی کا نرم و نازک ہاتھ لوہے کے ہاتھ میں ڈھل چکا ہے۔ وہ بڑے غور سے اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے پھر لڑکی کو جو مسکرا کے، اپنا دوسرا ہاتھ اس کی طرف بڑھائے کھڑی ہے۔ چر یخ چراخ، گراریوں کے دانت، ان میں چمکتا

موبل آئل۔ یکدم اس کا جسم تھرتھرانے لگتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ لڑکی کے بڑھے دوسرے ہاتھ میں تھما دیتا ہے پھر فوراً ہی کھینچ لیتا ہے اور اس کے وجود میں بھونچال آجاتا ہے۔ اس کی آنکھیں اپنے ماتھے کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔ پیٹ سے خلا ابھر کے اس کے گرد سمندر کی طرح محیط ہو جاتا ہے۔

تم کہاں ہو؟ یہ، یہ پھر سمندر کی باہیں مجھے۔ تم کہاں ہو؟ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سیپ کا منہ کھول دو کہ چمکتے موتی کی روشنی پھیلے۔ نہیں، میں سمندر کی تہہ میں اتر اہوں پر سیپ کو نہیں چھوؤں گا مبادا یہ بھی لوہے کا بن جائے۔

وہ آنکھیں مل کے سامنے دیکھتا ہے۔

لوہے کے بازو سہارا دینے کے لئے میری طرف بڑھے ہیں، آنکھیں بال بیرنگ، بازو پسٹن۔ میں نے تو نرم نازک جیتے جاگتے ہاتھوں کو پکڑنے کی کوشش کی تھی، انہیں چھوا تھا، اور یہ، یہ مشینوں کی آواز۔ وہ لڑکی کہاں گئی۔ اوہ یہ اس کا گریبان ہے۔ ساڑھی پہنے روبو لڑکی کی ایک دوسرے کے ساتھ جڑی، بلاؤز میں پھنسی پھنسی انار چھاتیاں، زندہ، سانسوں سے مرتعش، باقی سب لوہا۔

اس کے سر میں سمندر کی لہر آکے ٹوٹتی ہے۔ وہ اپنی خاردار زبان اپنے پپڑی جمے ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔ اس کے کانوں میں لاتعداد مشینیں چلنے لگتی ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کو لڑکی کے گریبان کی طرف بڑھتا دیکھتا ہے کہ لڑکی کے لوہے جسم میں اسے دہیں زندگی دھڑکتی دکھائی دیتی ہے۔

لڑکی کی چیخ فضا میں بلند ہوتی ہے۔

انار چھاتیاں؟ نہیں، لوہے کے دو پیالے آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ وہ فوراً اپنے ہاتھ کو دیکھتا ہے۔

میرے ہاتھ کو کیا ہوا کہ امرت بھرے تازہ مٹی کے پیالوں کو بھی لوہا بنا گئے۔

وہ سرخ سرخ آنکھوں سے لوہے میں ڈھلی روبو لڑکی کو گھورتا ہے۔ لڑکی کے نازک گلابی کی پنکھڑی ہونٹ بھینچتے ہیں۔

—— پاگل۔

وہ قریب سے بھاگ کر گذرتے ناگ کا سر پکڑ لیتا ہے۔

لڑکی ساڑھی کا پلّو پوری قوت سے کھینچتی ہے۔ بھاگ جاتی ہے۔ پلّو کا سرا اس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔

تو یہ ناگ کا سر نہیں؟ وہ ہاتھ میں پکڑی کالی لیر کو غور سے دیکھتا سوچتا ہے اور یہ کپڑے کی لیر ہے، لوہا نہیں بنی؟

وہ بے بسی اور غصے میں لیر کو ریت پر دے مارتا ہے اور جنون کی حالت میں گھٹنوں پر گر کے اپنی اکڑی ہوئی انگلیوں سے گیلی ریت میں دیوانہ وار گڑھا کھودنے لگتا ہے۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ شکنجے میں کسا جاتا ہے، تشنج میں گرفتار وہ ہانپتا ہوا اپنے کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرتا ہے اور کروٹ لے کر گھٹنے اور بازو اس انداز میں سمیٹ لیتا ہے جیسے ماں کے شکم میں بچہ۔

رفتہ رفتہ، اس کے تنے ہوئے ریشے تھکاوٹ میں رچ جاتے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں پر رینگتے تھکے پردوں کی اوٹ سے دیکھتا ہے کہ سمندر کے سانس اس کے منہ سے بہتے جھاگ میں پھوٹ پھوٹ بہتے ہیں اور چٹان کی دراڑ سے نکل کر کئی چھوٹے چھوٹے کیکڑے اس کی جانب رواں ہیں۔

وہ گڑھے کی آغوش میں اپنا چہرہ چھپا کر پوری قوت سے آنکھیں بھینچ لیتا ہے اپنی دانست میں جیسے موت کے سکوت میں پہلا قدم رکھ دیتا ہے،

کہ وہ تھکاوٹ میں چور چور، ہار کے یہ جاننے کی خواہش ترک کر دیتا ہے کہ یہ اسے کیا ہو جاتا ہے کہ۔۔۔۔

ریبیز

یہ کہانی کسی بھی ملک کے کتوں کی ہو سکتی ہے۔
ملک کو ایک بستی میں سمٹا کر دیکھو تو یہ کہانی کسی بھی بستی کی ہو سکتی ہے۔
یوں تو یہ کہانی ایک گھر ہی کے کتے کی ہے۔

لیکن یہ تو بہت بڑھیا نسل کا تابعدار کتا تھا۔ آج اسے کیا ہو گیا ہے۔
وہ اسے غور سے دیکھتا ہے۔

RABIES - دراصل اب گھریلو کتے ہی اس متعدی مرض ، ریبیز (جنون سگ گزیدگی) کے جرثومے (وائرس) کا مخزن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک عرصے تک اس جرثومے کو بغیر کسی ظاہری علامت کے لئے پھرتے ہیں۔ یہ جرثومہ جسم کے نیوراتی نظام پر اثرانداز ہوتا ہے اور رال کے غدودوں کے ذریعے رال میں گھل مل جاتا ہے۔ کسی تازہ خراش پر یہ رال لگ جائے یا اس جرثومے کا مخزن کتا کسی کو کاٹ جائے تو اُس کو بھی یہ مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ مرض دنیا بھر میں عام تھا، اب یہ سمٹ سمٹا کر ان ملکوں میں محدود ہو گیا ہے جنہیں عرفِ عام میں نو آزاد، ترقی پذیر ممالک کہا جاتا ہے۔ مغربی ممالک یعنی ترقی یافتہ دنیا میں گھریلو کتوں کے باوجود اس مرض پر قابو پا لیا گیا ہے، کتوں کی آبادی کو مکمل کنٹرول میں لے آنے کی وجہ سے۔ اب یہ غریب ملک کی بیماری ہے (جہاں کتوں کی بہتات پر مغربی ماہرین کے مشوروں کے باوجود توجہ دینا محال ہے کہ ان کے حالات ہی ایسے ہیں۔ بعض اوقات مغربی ماہرین کے مشوروں پر مغربی ممالک کی امداد اس سلسلے میں حالات کو قابو میں لانے کے بجائے مزید مخدوش کر دیتی ہے کہ مقامی اربابِ اختیار کتوں پر کنٹرول کرنے اور ان کی صحت پر توجہ دینے کے بجائے اپنی صحت پر زیادہ توجہ دینے لگتے ہیں اور

صحت مند، طاقتور، چاق وچوبند، صاف ستھری کھال جیسے روز پالش کی جاتی ہو، چہرے پر خونخواری جیسے اس گھر گھر کے مکینوں کی طرف بُری نیت سے آنکھ اٹھا کر دیکھنے والے کی تکا بوٹی کر دے گا، گردن میں چمڑے کے پٹے کے بجائے ریشمی کالر جس پر چھوٹے بڑے گول سنہری ٹھپے، تمغے۔

گھر کے مکینوں نے اس کتے کو اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر پالا ہے۔ بڑے پیار سے اعتماد اور ایقان سے سدھایا ہے اپنی خوش حالی کے عوض کہ گھر کے تعمیر شدہ، زیر تعمیر حصے احاطوں میں اِدھر اُدھر بکھرا اسٹا تعمیراتی سامان، سونا چاندی، اناج، یعنی تھوڑا بہت جو بھی انہیں ورثے میں ملا ہے اس کی حفاظت کی جا سکے اور وہ سب بے خطر ہو کے زیرِ تعمیر حصوں کو مکمل کر سکیں، بے فکر ہو کے اپنے خوشگوار مستقبل کی تخلیق کر سکیں۔

وہ کہ جس کے جسم کا ریشہ ریشہ ہواؤں کی سرسراہٹ پر بھی پھڑک پھڑک جاتا تھا، جو لمحہ بھر کے لئے نچلا نہیں بیٹھتا تھا، گھر کی حدوں، دروازوں کی پاسبانی کا جذبہ اور وفا شعاری لئے

بہ صورتِ حال ہر فریق کے حق میں جاتی ہے۔ اس سائنسی حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان سب کی صحت کا راز، ان پالتو کتوں کی آبادی پر مکمل کنٹرول اور ان کے حفظانِ صحت میں مضمر ہے اس مرض کا واحد علاج یہ ہے کہ ایسے کتوں کو فی الفور مار دیا جائے۔ اگرچہ موت ان کا مقدر تو ہوتی ہے لیکن انہیں فوراً مار دینا حفظ ماتقدم کے لئے ایک ضروری امر ہے تاکہ یہ مرض پھیل نہ سکے۔ کتے کے کاٹے کو فوراً ویکسین لگائی جائے۔ اگر ویکسین بے اثر ثابت ہو تو جرثومے کی ہلاکت خیزی کی قوت اور تعداد کے مطابق جلد یا بدیر اذیت ناک موت یا پر سکون ابدی نیند باؤلے کتے کی طرح مریض کا بھی مقدر ہوتی ہے کرا ہے بیز کی دو قسمیں ہیں، متشدد اور خاموش۔

کلینیکل ٹراپیکل ڈزیزز (۱۹۵۸ء) مصنفہ: ڈاکٹر آر۔ ڈی آڈمز۔ ایم ڈی۔ ایف آر سی پی۔ ڈی ٹی ایم اور ڈاکٹر بی جی ماے گریتھ۔ ایم اے۔ ایم بی۔ ڈی فل۔ ایف آر سی پی (لندن، ایڈنبرا)

جنونِ سگ گزیدگی، ایک مطالعہ، مصنفہ: ڈاکٹر سید انور سجاد علی۔ بی ایس سی، ایم بی بی ایس (پنجاب) ڈی ٹی ایم اینڈ ایچ (انگلستان)

کستاں کستاں لیے پھرتی تھی، آج بالکل سست ہے۔ وہ کان جو ہمیشہ الف رہتے تھے آج بے بس کر گرے ہیں۔ اس کی مضبوط ٹانگوں پر طاقتور جسم پتے کی طرح لرزتا ہے اور طاقتور جسم کے نیچے اس کی مضبوط ٹانگیں خشک شاخوں کی طرح تھرآتی ہیں جیسے ابھی گرا کر گرا۔ گھر کے بڑے دروازے سے ہٹ کر بجری کے ڈھیر کے قریب کھڑا ہانپتا کانپتا، گدلی دھندلائی آنکھوں سے اسے یوں دیکھتا ہے جیسے کبھی شناسائی ہی نہ تھی۔

وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اپنے کتے کا نام لے کر بڑے پیار سے بلاتا ہے۔

کتا پلک بھی نہیں جھپک سکتا کہ اس کی آنکھیں دلدل میں پھنسی ہیں۔

وہ اسے ڈانٹتا ہے، کتے پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ بس، ہانپتا کانپتا دلدل میں پھنسی آنکھوں سے اسے دیکھے جاتا ہے۔

___ یہ تو بہت وفادار تھا۔

وہ آہستہ آہستہ کتے کی طرف بڑھتا ہے، آہستہ آہستہ دلدل میں پھنسی کتے کی آنکھوں میں دھندلاہٹ چھٹنے لگتی ہے اور گدلے پن کی جگہ ایک عجیب سی خصومت کی چمک پھیل جاتی ہے جس سے وہ آگاہ نہیں کہ وہ سوچ میں گم آہستہ آہستہ کتے کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ کتے کے جسم کی تھرتھراہٹ قریب آتے قدموں کے باعث تیزی اختیار کر لیتی ہے اس کا منہ رفتہ رفتہ کھلنے لگتا ہے۔

وہ کتے کے قریب جا کے جھکتا ہے۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے ہی لگتا ہے کہ کتا بری طرح ہانپتا کانپتا، لڑکھڑاتا بڑی مشکل سے گھوم کر، حلق سے انتہائی غیر کتیانہ آوازیں نکالتا، اپنی دم کو محبت کے اظہار میں لہرانے کے بجائے پچھلی ٹانگوں میں دبا کر اینٹوں کے ڈھیر کی جانب ہو لیتا ہے۔ اپنی طرف پیٹھ کے باعث وہ کتے کے منہ سے آدھی لٹکتی لرزتی زبان کو نہیں دیکھ پاتا جس سے سرخی مائل بھورے رنگ کا لعاب پھسلنے لگا ہے۔

کتا اینٹوں کے ڈھیر میں یوں گھسنے کی کوشش کرتا ہے جیسے اس کمین گاہ میں روپوش ہو جانا چاہتا ہو۔

کتے کی یہ حالت دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کتا بہت بیمار ہے اور اسے اس کے

ماہر معالج کی طرف فوراً رجوع کرنا چاہیئے۔

اس وفادار محافظ کتے کی صحت اور طاقت کو قائم رکھنے کے لئے جدید ترین تربیت اور کھال کی لشک کو برقرار رکھنے کے لیئے اور دانتوں پنجوں کی دھار کو مسلسل تیز رکھنے کے لئے اور اس کے دہشت ناک چہرے کی دہشت کو دائم رکھنے کے لیئے شروع ہی سے ایک ماہر معالج مقرر ہے۔ یہ معالج اتنا عرصہ سات سمندر پار رہ کر کتوں میں مہارت حاصل کر کے آیا ہے کہ یہ پہچاننا مشکل ہے کہ معالج یہاں کا ہے یا وہاں کا۔ اس معالج کو گھر کے بڑوں نے اسی وقت اپنے لئے مقرر کر لیا تھا جب وہ نئے نئے یہاں کے وارث بنے تھے یعنی اپنے والد کی وفات کے بعد۔ اگرچہ اس کتے کی اب یہ تیسری نسل ہے لیکن معالج وہی ہے۔

جب سے اسے گھر کا بڑا تسلیم کیا گیا ہے تب ہی سے اس کی کوشش رہی ہے کہ وہ اس معالج کو بدل دے کہ اوّل تو ان کے والد کتوں کے قائل ہی نہیں تھے، معالج کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور پھر ایسا معالج کہ جس کی غیر معمولی دلچسپی اور گھریلو معاملات میں جا بے جا دخل اندازی کو وہ ہمیشہ شک کی نظروں سے دیکھتا رہا ہے۔ معالج گھر پہ آنے کی فیس لیتا ہے نہ کلینک پر۔ اسے یقین ہے کہ وہ اپنی فیس اس رقم میں شامل کر دیتا ہے جو ان کے محافظ کتے کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے پر خرچ ہوتی ہے، جسے وہ تین نسلوں سے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر اپنی خوشحالی کے عوض ادا کرتے آتے ہیں، کبھی نقد، کبھی ادھار۔

وہ اپنے اس غیر مرئی، جبلّی سے احساس کو اپنے گھر کے مکینوں پر ثابت نہیں کر پایا کہ معالج کی نیت ٹھیک نہیں۔ وہ ٹھوس ثبوت مانگتے ہیں۔ اگرچہ وہ اسے اپنے میں سب سے بہتر جان کر اسے اپنا بڑا تسلیم کر چکے ہیں لیکن وہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اس گھر کے باثر مکیں اس معالج کی قابلیت، افادیت کے بہت قائل ہیں جنھوں نے کتے کو ہر لحاظ سے اوّل درجے کا بنا رکھا ہے۔ باقیوں کو اتنی فرصت نہیں کہ خود کو اپنے پیٹ کے جال سے چھڑا کر اس سلسلے میں کچھ کر سکیں۔ اگرچہ وہ اس مؤقف کے قائل ہیں کہ اگر گھر کا ہر فرد گھر کا محافظ ہو تو کتا پالنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ سوچ کا یہی انداز ان کے والد کا بھی تھی پہ وہ تو ان کے لئے اس ورثے کو حاصل کر کے کچھ ہی عرصہ بعد فوت ہو گئے تھے۔ آج

مرے کل دوسرا دن۔ وہ والد کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے کیوں انہیں اپنا پیٹ نہیں کاٹنا پڑے گا، خوشحالی ان کے قدم چومے گی، پر کنبے کے بااثر افراد کو اپنی ناک سے آگے کچھ نظر نہیں آتا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کئے اپنی اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتے اس کی ہر بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ معالج ان کا دوست ہے جو تین نسلوں سے مقرر ہے اگرچہ کتے کی اب یہ تیسری نسل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ بااثر مکینوں کے ساتھ معالج کے تعلقات کو بھی شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن اس سلسلے میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا کہ اس صورت میں اسے اس مقام سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے کہ یہ بااثر افراد کتے اور معالج کے بہت قائل ہیں کہ ایک مرتبہ اس نے چوروں ڈاکوؤں کے حملے کو بڑی جرأت اور دلیری سے پسپا کر دیا تھا۔

وہ خاموشی سے کشمکش کی اذیت سہتا، رفتہ رفتہ دھیرے دھیرے اس گھر کو خوشحالی کی جانب کھیتا رہتا ہے، اس امید میں کہ ایک روز آئے گا سب تسلیم کریں گے کہ معالج کی نیت ٹھیک نہیں اور جس گھر میں کتا ہو وہاں رحمتوں برکتوں والی راتوں میں رحمت کے فرشتوں کا نزول نہیں ہوتا۔

اور وہ اتنا کم ظرف نہیں کہ چند لوگوں سے دل برداشتہ ہو کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے کہ اکثریت نے اس کی صلاحیتوں پر اعتماد کیا ہے کہ وہ انہیں خوشحالی سے ہمکنار کر دے گا۔

وہ سر کو جھٹک دیتا ہے۔ یہ ایسی باتیں سوچنے کا وقت نہیں۔ اس وقت کتے کو فوری توجہ کی ضرورت ہے ورنہ ہمارا گھر اور اس کے مکیں

پر اتنی حفاظت، لاڈ پیار کے باوجود یہ بیمار کیوں ہو گیا ہے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔

—— اوہ۔

وہ یکدم چونک اٹھتا ہے۔

—— او وہ! کتے کی اس کیفیت کا معالج کی کتیا سے تو کوئی تعلق نہیں؟ جسے وہ اس روز اپنے ساتھ لایا تھا۔

اسے اچانک یاد آتا ہے۔

معالج ان کے ہاں معمول کے مطابق جنرل چیک اپ کے لئے آتا ہے۔ وہ اور معالج روایت کو ملحوظ رکھتے ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں۔ اس کا کتا، چاق و چوبند، دم ہلاتا معالج کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کو اپنے کتے کی یہ حرکت پسند نہیں آتی۔ وہ لاکھ اس کا معالج سہی پر کتے کی دم گھر کے مکینوں کے علاوہ اور کسی کے لئے نہیں ہلنی چاہئے۔

کتے کی تھوتھنی جیسے فضا میں کچھ سونگھتی اٹھتی ہے، نتھنے تھراتے ہیں اور وہ چھوٹی چھوٹی پھلانگیں لگاتا اچھلتا کودتا ہے۔ خواہ مخواہ۔

اس کی نظریں معالج کی لمبی سیاہ کار کی طرف اٹھتی ہیں تو کتے کی اس بے قراری کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ کار کی کھڑکی سے ایک خوبصورت نازک سی کتیا جھانکتی ہے جس کی گردن میں اس کے اپنے کتے کی طرح کا لیکن زیادہ نفیس ربن کا پٹہ ہے جس پر چھوٹے چھوٹے طلائی نگینے جڑے ہیں۔ معالج کی کتیا اچھل کر کھڑکی سے باہر آجاتی ہے۔ کتے کے جسم میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ وہ کتیا کی طرف بڑھنے لگتا ہے کہ وہ دہاڑ کر اپنے کتے کو منع کرتا ہے۔ معالج بہت ہی محبت بھرے انداز میں اسے منع کرتا، اس کے اور کتے کے درمیان آجاتا ہے۔

—— میں اسی لئے اسے ساتھ لے کر آیا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اس سے تمہارے کتے کے پلے حاصل کروں، تمہیں بھی تو ضرورت پڑے گی

—— لیکن،

لیکن اس دوران اس کا کتا اور معالج کی کتیا اچھلتے کودتے ایک دوسرے کے جسم کے ساتھ جسم رگڑتے بہت دور جا کر جھاڑیوں میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ معالج کے ہونٹوں پر پھیلی پُراسراری مسکراہٹ ہنسی میں پھٹ پڑتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بھی ہنس کر اس کی ہنسی کا ساتھ نہ دے تو اور کیا کرے۔

پھر معالج اس کے گھر کے تعمیر شدہ، زیر تعمیر حصوں، سونا چاندی، اناج، عماراتی سامان کے بارے میں مشورے دینے لگتا ہے۔

دور سے کتیا اور کتے کے غرّانے، بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں جو اسے معمول کے مطابق

محسوس نہیں ہوتیں۔ معالج کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ وہ بھی کھسیانا سا ہو کر مسکرا دیتا ہے۔

پھر کتیا بھاگتی آتی ہے اور اچھل کر معالج کی گود میں سوار ہو جاتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کا کتا تھکا ہارا آتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ سوالیہ نظروں سے معالج کو دیکھتا ہے۔

—— تھکاوٹ ہو ہی جایا کرتی ہے۔ تمہارا بے حد شکریہ۔

معالج گود میں کتیا کو لئے ہنستا ہوا کار میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔

وہ اپنا سر کھجاتا اس سارے واقعے کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کتا قریب آتا ہے۔ وہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا اسے گود میں اٹھا لیتا ہے۔ اسے اپنے بازوؤں پر چپچپاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جلدی سے کتے کو زمین پر اتارتا ہے، اپنے بازو اور ہاتھ دیکھتا ہے جہاں تازہ تازہ لہو لگا ہے۔ وہ گھبرا کے کتے کے جسم پر زخم تلاش کرتا ہے۔ کتے کے پیٹ پر اس کی پچھلی ٹانگوں کے قریب خراشیں نظر آتی ہیں جن سے خون رستا ہے۔ وہ دل ہی دل میں معالج اور کتیا کو گالی دیتا ہے اور کتے کو گود میں اٹھا کر والہانہ پیار کرتا گھر کی عمارت میں جا کر خراشوں کو روئی سے صاف کرتا ہے۔ گھڑی دیکھتا ہے کہ معالج کلینک پہنچ گیا ہوگا۔

وہ معالج کو فون کرتا ہے۔ کتے کی خراشوں کے بارے میں پوچھتا ہے۔ دوسری طرف سے معالج کی شرارت بھری ہنسی سنائی دیتی ہے کہ جانوروں میں محبت کرنے کے انداز ایسے ہی ہوتے ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں، ایسے زخم خود بخود مندمل ہو جاتے ہیں، علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اسے یاد آتا ہے۔

پھر اس کا کتا پہلے سے زیادہ طاقتور، صحت مند نظر آنے لگا تھا۔ پہلے سے زیادہ شگفتہ کھال، پہلے سے زیادہ چاق و چوبند، اس کے زخم، خراشیں خود بخود مندمل ہو گئی تھیں۔

تو آج اسے کیا ہو گیا ہے کہ اس کا جسم کہ حس کا ریشہ ریشہ ہوا کی سرسراہٹ پر بھی پھڑک پھڑک جاتا تھا، جو لمحہ بھر کے لئے بھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا، گھر کی حدوں، دروازوں کی

پاسبانی کا جذبہ اور وفا شعاری اسے چاروں اور کشاں کشاں لئے پھرتی تھی، آج یوں ہانپتا، کانپتا، لڑکھڑاتا، ڈولتا اس سے لاتعلق ہو کر اینٹوں کے ڈھیر کی اوٹ میں چلا گیا ہے۔

وہ بھاگتا ہوا اندر جا کے معالج کو فون کرتا ہے۔ کلینک سے کوئی جواب ملتا ہے نہ اس کے گھر سے۔ وہ بھاگتا ہوا باہر آتا ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر کی طرف بڑھتا ہے۔

کتے کی زبان سے سرخی مائل گہرے بھورے رنگ کی گاڑھی رال ٹپکتی ہے۔ اس کے حلق میں پھنسی غرغراہٹ اس سے نگلی جاتی ہے نہ اگلی جاتی ہے۔ وہ تشنج میں کانپتا، چھوٹے چھوٹے لرزتے قدم اٹھاتا چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے سامنے اینٹ، روڑا، پتھر، سریا، اناج، سونا چاندی جو بھی چیز آتی ہے وہ دیوانہ وار اپنے تیز نوکیلے دانتوں گڑے مضبوط جبڑوں میں چباتا نگلنے کی کوشش کرتا ہے پر اگل دیتا ہے کہ حلق کے پٹھے تن گئے ہیں اس کی آنکھوں میں مکمل خصومت کا جال پھیل گیا ہے۔

وہ خود کو کتے کی آنکھوں میں پھیلے جال سے بچاتا گھر کے ستون کی اوٹ میں ہو جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کتے پر طاری تشنج رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگا ہے اور وہ تھکا ہارا ٹوٹا، زمین پر لیٹ کے ہانپنے لگتا ہے۔ اس کی زبان اسی طرح سرخی مائل گہرے بھورے رنگ کی گاڑھی رال میں کچ پوری طرح لٹک گئی ہے۔ اسے کتے کے پیٹ کے اتار چڑھاؤ کی تیزی سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی مرا نہیں لیکن حالت مردوں سے بدتر ہے۔

وہ روہانسا، بھاگتا ہوا معالج کے کلینک جاتا ہے

کلینک بند ہے۔

معالج اپنے گھر پر بھی نہیں۔

اب وہ کسی اور معالج کی طرف کیا منہ لے کر جائے، اور پھر گھر کے مکینوں سے مشورہ کئے بغیر؟ بالآخر لوگ اسے الزام نہ لگا دیں گے؟

وہ دیوانہ وار بھاگتا اپنے گھر واپس آتا ہے۔ بڑے دروازے کو بند پاتا ہے۔ گھر سے آتی عجیب و غریب چیخ و پکار سن کر پریشان ہو جاتا ہے۔

وہ بڑی مشکل سے دروازہ پھلانگ کر اندر کودتا ہے اور سامنے دیکھتے ہی ستون کی

اوٹ میں ہو جاتا ہے۔

سامنے، اس کے کتے کے کاٹے کئی اور کتے، چٹنے زبانیں لٹکائے، آنکھوں میں خصومتوں کے جال لئے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں، اپنی لٹکتی زبانوں سے ٹپکتی گاڑھی رال کو ایک دوسرے کے جسموں میں اتارتے ہیں۔ گھر کے بعض بااثر مکین بھی ان کے وار سے نہیں بچے اور یہ تفریق کرنا دشوار ہے کہ کتے کون ہیں اور مکین کون۔ یہ سب ایک دوسرے کو کاٹتے، چیرتے، پھاڑتے، آنکھوں میں خصومتوں کے جال اور چہروں پر وحشت لئے، حلق میں جمع ہوتی گاڑھی رال میں پھنسی آوازوں کو اگلنے کی کوشش میں عجیب غیر کتیانہ بھونکاریں نکالتے بجری کے سب سے اونچے ٹیلے کے گرد اچھلتے کودتے طواف کرتے ہیں جس کی چوٹی پہ ماہر معالج اپنی کتیا کو ساتھ لئے بیٹھا ہے۔

ماہر معالج کی آنکھوں میں بھی اب خصومت ہی کے ڈوروں کے جال ہیں، وہ بھی ان سب کی طرح لرزے میں مبتلا ہے۔ اس کی زبان بھی دہن سے ٹپکتے سرخی مائل گہرے بھورے رنگ کے لعاب میں ڈوبی ہے۔ اس کی کتیا اس کے قدموں میں بڑے اطمینان و سکون سے لیٹی ہے اور وہ بڑے پیار سے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ایسی شان سے یوں چاروں اور دیکھتا ہے جیسے اس نے ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے سامنے ڈال کر کہ اپنے پیٹ میں جلتی آگ کو بجھانے میں مشغول ہو جائیں، وہ پہاڑی فتح کر لی ہے جس پر وہ اب حاکم بنا بیٹھا نظر آتا ہے۔

وہ تیزی سے پلٹ کر اپنے گھر کے تعمیر شدہ حصوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گھر کے مکین کھڑکیوں، دروازوں، ستونوں کی اوٹ میں چھپے چپ چاپ، دہشت زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھتے ہیں۔ چند ایک کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، سریے، گینتیاں، کدالیں ہیں۔ وہ ان کتوں اور کتوں کے کاٹے مکینوں پر وار کرنے کی نیت سے دبے پاؤں آگے بڑھتے ہیں پر جانے کیا سوچ کر پھر پلٹ آتے ہیں۔

میرے پاس کوئی گولی چلانے والا ہتھیار ہوتا تو —— چند ایک غیر معمولی لمبی بھونکاریں اس کی سوچ کو کاٹ کر رکھ دیتی ہیں۔

وہ چونک کر پھر بجری کی پہاڑی کی طرف دیکھتا ہے۔

اب چند کتے اور چند مکیں اسے زمین پر گرے دم سادھے نظر آتے ہیں۔ جب دیر تک ان میں کوئی حرکت نہیں ہوتی تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ اپنی ہی دہشت کی نذر ہو گئے۔

یہ اچھا ہے کہ عام مکیں باہر نہیں نکلے۔ وہ سوچتا ہے۔ لاٹھی سریہ وغیرہ بھی تو اس وقت چند ایک کے پاس ہے۔ عقلمندی کی انہوں نے کہ اپنے آپ کو اپنی چپ میں محصور کر لیا ورنہ ان سب کا حشر بھی یہی ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ سب جنونی اسی طرح خود ہی اپنے ہیجان، تشنج اور وحشت کی نذر ہو جائیں۔

مرتے ہوؤں کو دیکھ کر معالج کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نہیں آتے۔ وہ بڑی خود اعتمادی سے ان مرے ہوؤں کو ایک نظر دیکھ کر شیطانی نظروں سے کھڑکیوں، دروازوں، ستونوں کی جانب دیکھتا ہے۔

وہ ستون کی اوٹ میں چونک اٹھتا ہے۔

اس سے پیشتر کہ معالج اپنے گرد دیوانگی کے رقص میں طواف کرنے والوں کا رخ کھڑکیوں، دروازوں، ستونوں کی طرف موڑ دے، وہ پاس ہی پڑی گینتی ہی اٹھا کر دیوانہ وار کتوں، مکینوں کے کاٹے کتوں، مکینوں پر پل پڑتا ہے۔

اسے دیکھ کر کھڑکیوں، دروازوں، ستونوں کی اوٹ میں چھپی عجب حرکتی کی مہریں ٹوٹتی ہیں اور وہ سارے کھڑکیوں، دروازوں، ستونوں کی اوٹ سے دھاڑتے باہر نکل آتے ہیں اور لاٹھی، سریہ، کدال، گینتی، اینٹ، پتھر جو بھی جس کے ہاتھ آتا ہے لے کر ایک دوسرے کے کاٹے کتوں، انسانوں کے ہلکائے ہجوم پر پل پڑتا ہے۔

معالج حیران و پریشان بجری کی چوٹی پر بیٹھا، بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اور وہ جسے انہوں نے اپنوں میں سب سے بڑا تسلیم کیا تھا اور گھر کی ذمہ داری سونپی تھی، گھر کی ذمہ داری کو نبھانے کو دیوانہ وار گینتی ہی چلاتا آگے بڑھتا پہاڑی پر چڑھنے لگتا ہے۔ اس کا رخ معالج کی طرف ہے جسے اس نے ہمیشہ تشکیک کی نظروں سے دیکھا ہے۔

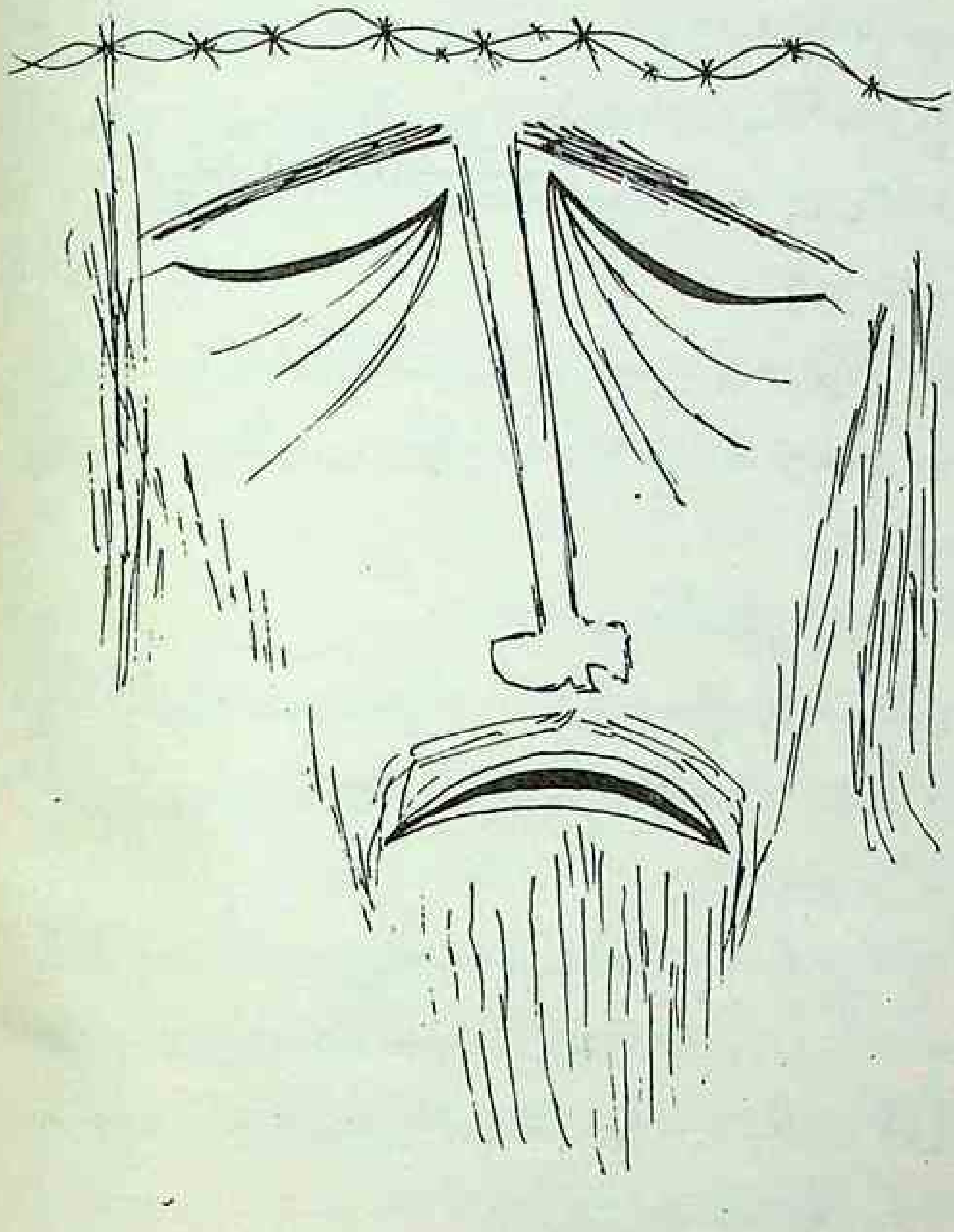
تو جس گھر میں رحمت کے فرشتوں کا نزول نہ ہوتا ہو اس گھر کی حالت کچھ ایسی ہی ہو

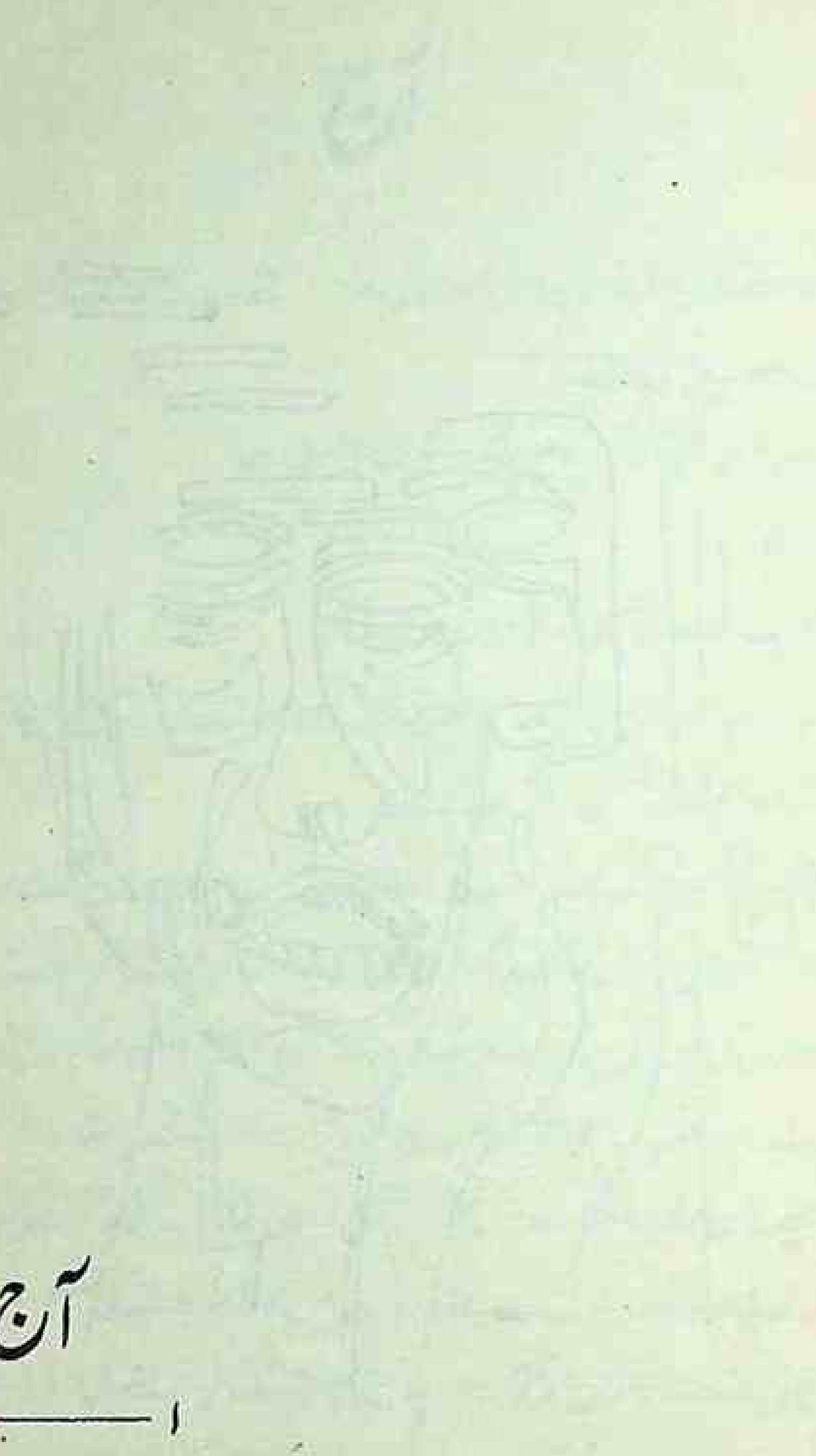
جاتی ہے۔

اور جس گھر میں کتا ہو، رحمتوں برکتوں والی راتوں میں اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آیا کرتے۔

یوں تو یہ کہانی ایک گھر ہی کے کتے کی ہے۔

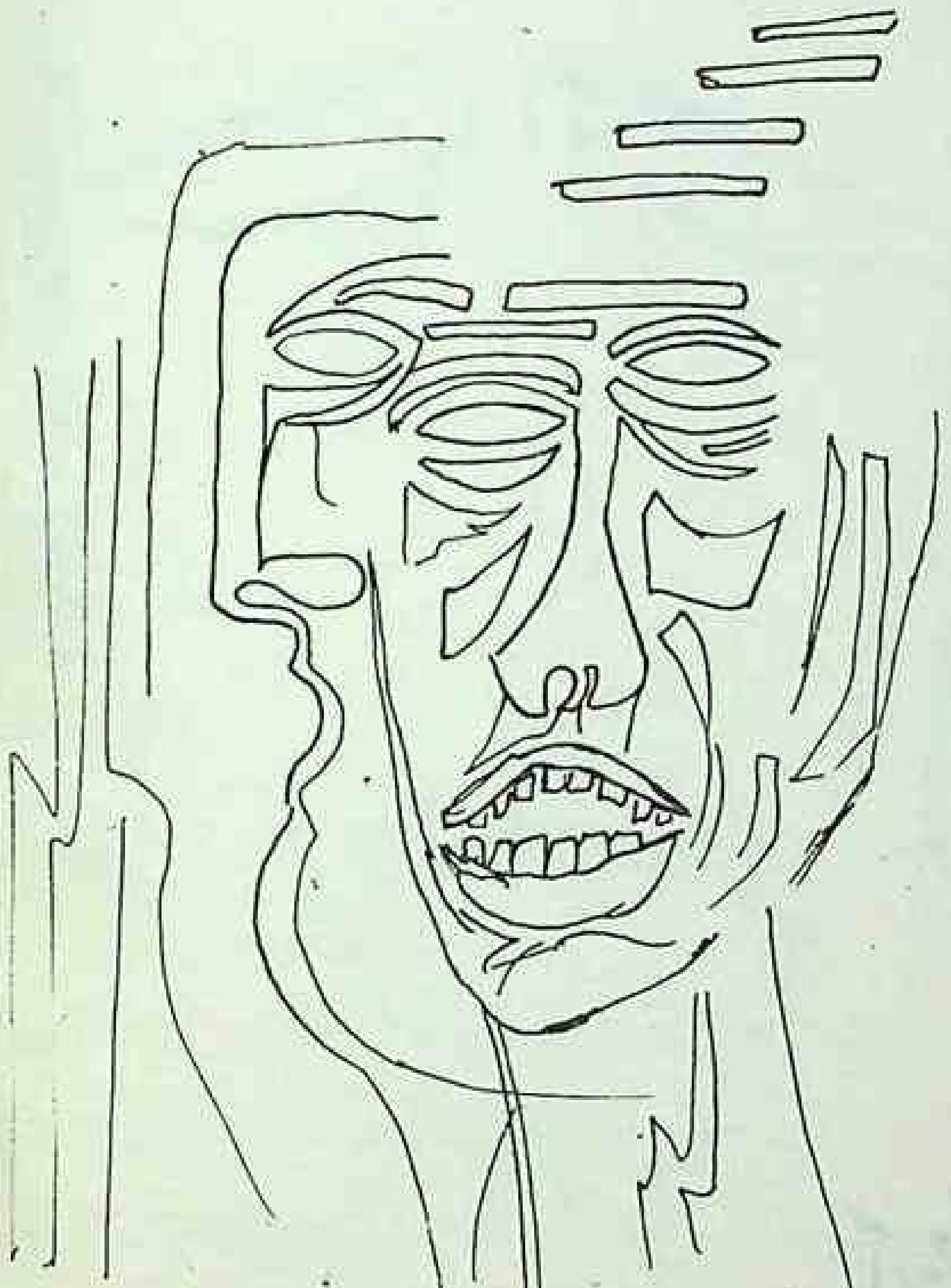






آج

۱ —— ۸



آج

(۱)

سامنے کی دیوار کا سایہ اس قدر تاریک اس لئے ہے کہ بھڑکتے آسمان میں اُبلتے سورج سے دہکتی دھوپ بہتی ہے۔

اس بہتی دہکتی دھوپ میں ایک بہت بڑا خلا ہے۔

سناٹا

'تاریک، دلدوز، کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا'

جو شدید اذیت میں گرفتار، لاتعداد جانوروں، جانداروں کی چیخ پر محیط ہے۔

'تاریک، دلدوز، کبھی نہ ختم ہونے والا۔

چارپائی گھسیٹنے کی آواز یا دروازہ کھلنے بند ہونے کی چرچراہٹ پُر تشدد کہ اس سناٹے، سکوت، سکون میں اس پُر تشدد آواز کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔

وہ بان کی چارپائی پر کم سے کم جگہ گھیرے، سمٹی سمٹائی بالکل ساکت لیٹی ہے۔ اعصاب تنے ہوئے جیسے گھر میں کسی نامعلوم کونے میں پڑے ٹائم بم کے پھٹ جانے کا اندیشہ جیسے اس خوفزدہ سناٹے میں پھٹتے آتش فشاں پہاڑ کے اڑ کر گرتے پتھروں کے نیچے دب جانے یا اس کے دہانے سے بہتے لاوے میں لاوا ہو جانے کی منتظر۔

بعض اوقات خاموش، دہکتی دھوپ میں پگھلتی فضا کو سامنے کی دیوار کے سامنے ایسے تاریک کمرے کے کسی کونے کھدرے میں چھپے، شدید گرمی کے باعث نیم بے ہوش جھینگر کی آخری تیکھی آواز، احساس کو سرد اور منجمد کر دیتی ہے۔ ہر وجود پر تنہائی سنڈھ دیتی ہے اور کسی متروکہ شے کی طرح اس پُر تشدد کائنات کے حوالے کر دیتی ہے کہ جس میں ہر لمحہ کسی اذیتناک حادثے کے رونما ہونے کا خوف ہمیشہ طاری رہتا ہے۔

کمرے کے تاریک سناٹے میں اس کو باہر سے کہیں دروازہ چرچرانے کی آواز سنائی

دیتی ہے۔

وہ چارپائی پر اسی طرح لیٹی رہتی ہے۔ ساکت، سمٹی سمٹائی، منتظر۔

اٹھ کر تنگ و تاریک غلام گردش میں جھانک لینے کا عمل یا سُست چہرے پر پانی کا چھینٹا

دینے کے لئے نلکے کو کھولنے کی حرکت اس خلا میں قدم رکھ دینے کے مترادف ہے۔ ایک بہت

ہی جرأت مند قدم۔

فضا میں معلق سناٹے میں نلکے سے پانی کا چلنا یا تنگ و تاریک غلام گردش میں جھانکنے

والی نظر ایک خواہش کا مظہر ہو گی،

ان کے سامنے التجا کا اظہار

جیسے کسی کریہہ شے کو چھو لیا جائے۔

جیسے چھپکلی کی تازہ کٹی دم کو تنکے سے کچوکا دے کر اسے چھینٹا تھراتا دیکھ کے کراہت محسوس کی

بان کی چارپائی پر کم سے کم جگہ گھیرے، سمٹی سمٹائی، ساکت اسے یوں ہی محسوس ہوتا ہے

جیسے اس تاریک سائے والی دیوار کی اور وہ اسی انتظار میں بیٹھے ہیں۔

یوں چھینٹے، تھرانے کے لئے

وہ اپنی چارپائی پر ہلتی تک نہیں۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے اس کی اس صورتِ حال سے

اس کا گرد و پیش اگر اس سے بے تعلق نہیں تو اسے قدرتی ردِ عمل جان کر مطمئن ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ جب کوئی اس چرچراتے دروازے کو کھولے،

اور سیڑھیوں کو بالکل سپاٹ، غیر جذباتی بے رنگ سکون میں دیکھے،

ایسی سیڑھیاں جن پر چڑھنے اترنے کا کوئی نشان نہیں، یاد کا کوئی نقش تک نہیں

اور جب کوئی تنگ و تاریک غلام گردش طے کر کے اس کمرے میں پہنچے،

کھڑکی پر پڑے چھیدوں والے ٹاٹ کے پردے کے کسی بھی چھید سے باہر جھانک کر

سامنے کے گھروں کی قطار دیکھے،

دکانوں پر کاروبار ہوتے اور بچوں کو گلی میں آنکھ مچولی، گیڑی کا ڈنڈا یا پٹھو کھیلتا دیکھے،

آوارہ کتوں اور بلیوں کو ایک دوسرے سے بیگانہ، بے پرواہ
اور بوڑھی عورتوں کو گلی کی، ڈھل جانے کی خواہش مند کنواریوں کے بارے میں آپس میں
سرگوشیوں کی صورت سکینڈل بازی میں مبتلا دیکھے
تو یہ امر یقینی جانو کہ جہاں تک ہو سکے گا وہ اسی طرح منتظر رہے گی
چارپائی پر سمٹی سمٹائی، کم سے کم جگہ گھیرے، ساکت۔
اس کی سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ وہ کچھ نہ کرے۔
زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس احتیاط سے اٹھے کہ کوئی جاگ نہ جائے، تاریک
مردہ غلام گردش اور سرد مہر سیڑھیوں کو آنکھوں میں لائے بغیر گھر سے باہر نکلے،
گلی میں گھروں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی رہے، گھوم پھر کے تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں
میں سمیٹ لے۔
محض اپنے پٹھوں اور جوڑوں کو زندگی کا احساس دلانے کی خاطر، یہ جانے بوجھے بغیر کہ
وہ کہاں جا رہی ہے۔ کسی بھی خواہش کا عدم وجود۔
اور پھر اس تاریک سامنے والی دیوار کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتی، کہ جس کی اور وہ تنکے
کے ذرا سے چھو جانے پر چھپکلی کی کٹی دم کی طرح تھرتھراتے، چھپٹنے کو تیار بیٹھے ہیں، اپنے گھر لوٹ آئے
ان سیڑھیوں اور غلام گردش کے تاریک، سرد مہر سناٹے کو نظروں میں لائے بغیر کہ جنہیں طے
کرنے والوں کا وہاں کوئی نشان نہیں، یاد کا کوئی نقش نہیں۔
اپنے کمرے میں آئے۔
اور ایک بار پھر بان کی چارپائی پر لیٹ جائے،
کم سے کم جگہ گھیرے، سمٹی سمٹائی، ساکت۔
ایک بار پھر منتظر، سناٹے میں
تاریک، دلدوز، کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا،
اس بہتی دہکتی دھوپ میں ایک بہت بڑا خلا

(۲)

سانولے سلونے، دودھ بھرے شفاف ملائم کٹورے۔

پہلے وہ ایک کٹورہ، دودھ چوسنے کے لئے پیش کرتی ہے پھر دوسرا

چوس چوس کر جب ان کے جبڑے نڈھال ہو جاتے ہیں

اور کٹوروں سے دودھ کے بجائے لہو کے قطرے رسنے لگتے ہیں تو وہ زبان سے لہو کا

ذائقہ چھونے سے پہلے منہ ہٹا لیتے ہیں۔

کٹوروں پر ان کے تیز، نوکیلے دانتوں سے خراشیں کھنچی نظر آتی ہیں اور ان خراشوں سے

ابھرے چھوٹے چھوٹے سرخ سرخ لعل۔

سانولے سلونے، شفاف ملائم، قطار در قطار ابھرے رِستے لعلوں جڑے کٹورے اب دودھ

سے خالی۔

وہ اسے گنگ کر دینے والی ایک تصویر دکھاتے ہیں جس میں کھڑکیوں، دروازوں پر دبیز پ

پڑے ہیں، جن کے پیچھے دودھ بھری نہریں بہتی ہیں۔ درختوں پر وہ پھل کہ جن کی خواہش کرو تو

خود بخود منہ میں چلے آتے ہیں۔

وہ تحیر میں ڈوبی بڑی سریع الاعتقادی سے اس تصویر کی طرف بڑھتی ہے، آہستہ آہستہ اس

آہستہ خرامی کے باوجود وہ اس تصویر کے ساتھ اس زور سے ٹکراتی ہے کہ اس کے وجود میں تریڑ

آ جاتی ہیں اور اس تصویر میں بھی۔

وہ دونوں کو ایک بار پھر مرمت کے لئے لے جاتے ہیں۔

وہ اس کو چاروں اور سے گھیرتے، نوکیلے دانتوں سے کاٹتے، تیز ناخنوں سے نوچتے اس

کی طرف سے ذرا سی مدافعت پر بھی اسے زمین پر گرا دیتے ہیں، لڑھکانے لگتے ہیں اِدھر سے اُدھ

ادھر سے اِدھر۔

پھر ان میں سب سے زیادہ طاقتور اسے کلائیوں سے پکڑ کر اٹھا لیتا ہے اور فضا میں اسے یوں گھمانے لگتا ہے جیسے زمین میں گڑے پنگھوڑے کے ستون سے لٹکتے، زور سے گھومتے، کاٹھ کے گھوڑے، خچر، اونٹ جن پر سوار بچے۔

وہ باری باری اسی طرح ستون سے بندھی گھومتی لڑکی پر سواری کرتے ہیں۔

جب ان سب کی آنکھوں میں ان کے سر گھومتے لگتے ہیں اور سروں میں کل کائنات چکر کھاتی ان کے وجود سے متلی بن کر ابھرنے لگتی ہے تو وہ خلا میں معلق ہونے کے خوف سے پنگھوڑے سے چھلانگ لگا دیتے ہیں اور ستون سمیت زمین پر گر کے، ان ہی چکروں میں لوٹتے پوٹتے زمین سے چمٹنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح جڑ پکڑ لیں، مستحکم ہو جائیں، لیکن ہاتھوں میں مٹھی بھر خاک کے سوا کچھ نہیں آتا۔

سانولے سلونے، شفاف ملائم کندن والی لڑکی ایک طرف کھڑی اپنے دانتوں میں انگشتِ شہادت دبائے، تحیر میں انھیں دیکھتی ہے، خشک ہوتی خراشوں سے ابھرتے لعلوں میں سکڑتے ہلکے ہلکے درد اور پستانوں کے اندر لہو سے مقطر ہوتے قطرہ قطرہ دودھ کی ٹیسوں سے لاتعلق۔

زمین پر لڑھکائے جانے سے اس کے جسم سے لپٹی مٹی اپنی خوشبو سمیت اس کے جسم کے ایک ایک مسام میں سرایت کر جاتی ہے۔

اور اس کے جسم کا سانولا سلونا پن اپنے دودھ کی خوشبو لئے زمین کے ذرّے ذرّے میں سرایت کر جاتا ہے۔

پر اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کے وجود زمین میں جڑیں نہیں پکڑتے۔

وہ اپنے اس عمل کو بے معنی، لاحاصل جان کر، کپڑے جھاڑتے زمین سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

وہ تحیر میں اسی طرح اپنے دانتوں میں انگشتِ شہادت دبائے کھڑی ہے۔

وہ شروع سے جانتے ہیں کہ سانولے سلونے، دودھ بھرے شفاف ملائم کندن والی کو مکمل طور پر اپنے بس میں کیسے رکھنا ہے کہ وہ بلا چون و چرا، بغیر کسی مزاحمت کے، انھیں پہلے

ایک کٹورہ دودھ چوسنے کے لئے پیش کرے پھر دوسرا،
وہ اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

اور اسے رہائشی سکیموں، تعمیراتی پلاٹوں میں تقسیم کر کے چوراہوں، سڑکوں، بازاروں، کمرشل سنٹروں یعنی ہر اور سے اس پر یلغار کر دیتے ہیں۔

کبھی کبھی اس سانولی سلونی کو شک ہونے لگتا ہے کہ یوں کھائے جانے کا ذوق کہیں اس کے بچپن ہی سے تو نہیں پروان چڑھا لیکن اسے یاد نہیں آتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ ان کی کھٹی میٹھی، یار و دلیسی، تلی سے آنے والی بو کو قبول کیسے کر لیتی ہے۔ کیا وہ اس بو سے اتنی مسحور ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے گرد سمٹتے، ان کے گھیرے میں محصور ہونے کا پتہ نہیں چلتا؟

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

شاید اس لئے کہ وہ اس کے دل و دماغ، جسم اور روح کو ہر پل، ہر لمحہ، ہر موسم اسی طرح ہمہ تن مصروف رکھتے ہیں۔

وہ دنیا کہ جس میں اسے ہر اور سے محصور کر لیا گیا ہے، اس دنیا کا کوئی مسئلہ نہیں — ان کے پاس خوف زدہ کر دینے والی برہنہ سفاکی ہے اور چندھیا دینے والے لشکارے کہ وہ ہر شے سے اس کا سایہ چھین کر اس کے تمام کھردرے پن، تمام ناہمواریوں کو مسطح کر دیتے ہیں۔

وہ اس کے تحیر کو جانتے ہیں، اس کمزوری کو خوب سمجھتے ہیں اور دنیا بھر کو بتاتے ہیں کہ وہ ان کے تلذذ میں برابر کی شریک ہے۔ اسی لئے وہ کبھی ہچکچاتے نہیں اور اس کے سانولے سلونے دودھ بھرے پستانوں پر نیز نوکیلے دانتوں سے خراشیں ڈالتے رہتے ہیں۔

پر یہ کوئی نہیں جانتا،

یہ کوئی نہیں جان سکتا

کہ اس سانولی سلونی کے اندر سے سب کچھ نکال دیا گیا ہے، صرف دودھ بنانے والے مشین رہنے دی گئی ہے۔ اس کے اندر صرف خلا ہے، چیتھڑے، بھوسا بھی نہیں بھرا گیا کہ گڑیا ہی دکھائی دے۔

وہ پتلی ہے
اور پتلیوں کا تماشا بھی
وہ تماشے سے فرار نہیں ہوسکتی کہ وہ ان کے تنگ گھیرے میں محصور ہے
وہ، تنہا
اس کے سوا اور کیا کرے کہ پہلے اپنا ایک کٹورہ ان کے منہ میں دے دے پھر دوسرا
سانولے سلونے، شفاف ملائم، دودھ بھرے
جن پر ان کے تیز نوکیلے دانتوں سے کھنچی خراشوں سے ابھرتے رِستے لعل،
قطارو در قطار جڑے
اور جب چوس چوس کر ان کے جبڑے نڈھال ہو جاتے ہیں
اور کٹوروں سے دودھ کی جگہ لہو کے قطرے رستے لگتے ہیں
تو وہ زبان سے لہو کا ذائقہ تھوکنے کے لئے منہ ہٹا لیتے ہیں۔

(۳)

وہ اپنے شہر کے سامنے سینہ سپر ہیں
عورتیں، مرد ایک ایک کر کے کٹتے، گرتے ہوئے،

دنیا کے غیر جانبدار اخبار، ریڈیو، ٹیلیویژن، لفظ، آواز کی صورت، تحریر میں ڈھلے مختلف پیکروں سے اُمڈتے کہ اس شہر کو شکست ہوئی کہ ہوئی

اور جانبازوں کی تعریفوں میں رطب اللسان
صرف خبر چاہیئے۔ نئی، سنسنی خیز، ہلاکت کی یا غیر متوقع فتح کی
سب طرف امن ہے، صورتِ حال قابو میں ہے،
شہر کی رگوں کے مکیں کہتے ہیں، اور شہر کے، لفظوں میں ڈھلے پیکر ان کی صدائے بازگشت۔
ان تمام خبروں سے بے خبر شہر کے سپوت سپوتریاں، اپنے شہر کو پردوں میں لئے ایک ایک کر کے کٹتے ہیں، گرتے ہیں۔

سامنے سے سینوں میں تیر اور پیٹھ میں خنجر، ڈاکٹر فرینکن سٹائن کے عفریت اور ڈریکولا کا گٹھ جوڑ ہو تو یوں ہی ہوتا ہے۔

زمین ہر روز جانے کتنوں کو اپنے سینے میں میٹتی ہے، پھر جنم نہیں دیتی
یہ ان کا بھی شہر ہے، جو اپنے ہی شہر کی رگوں میں بیٹھے نہیں چاہتے کہ جنگ طول پکڑے اس لئے نہیں کہ شہر کے سپوت سپوتریاں کٹتے گرتے ہیں، بلکہ اس لئے کہ شہر کی رگوں میں ان کا قیام طویل ہو اور ان کی زبانیں لہو کے تلذذ میں سدا نہاتی رہیں۔ اسی لئے وہ جو اس جنگ کو طول دیتے ہیں، اپنے شہر کے سامنے ایک ایک کر کے کٹتے، گرتے ہیں، کافر ہیں، غدار ہیں اور انہیں زمین کے زخموں میں بھر دیا جاتا ہے۔

رات کی تاریکی میں، جو مرکری روشنیوں کے باوجود روشن نہیں ہوتی، دو سائے تاریک گلیوں سے نکلتے ہیں، چوراہے میں آ کے ایک دوسرے کے ساتھ بغلگیر ہوتے ہیں اور چوراہے کے عین بیچ جلتی شمعیں بن جاتے ہیں

شہر کی رگوں کے مکین ان جلتی شمعوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ آتشبازی کا ایک منظر کہ ایسے شعلہ بار انار بھی کسی نے چھوٹتے نہ دیکھے تھے

ہر روز شہر کے چوراہے یوں روشن ہوتے ہیں

اب تو انہیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ ان میں سے کون کون چوراہوں میں روشن ہوئے اور کس کس کو زمین کے زخموں میں اتارا گیا ہے،

اور وہ، ضرورتوں کے دوست جو شہر کی رگوں میں بیٹھے ہیں، بھول جاتے ہیں کہ وہ کون ہیں، کس کے سپوت سپوتریاں ہیں۔

آتش فشاں انار، شہر کی آرائش

بے نور چوراہوں، بازاروں، گلیوں، گھروں کے لئے نور اور شہر کی رگوں کے مکینوں کے لئے سامانِ تفریح۔

تو صورتِ حال بالکل قابو میں ہے، شہر کے تنفسوں میں ڈھلے پیکر، شہر کی رگوں کے مکینوں کی صدائے بازگشت، امن اور زمین کی بقا، ڈریکولا اور فرینکن سٹائن کے عقریت سر دھنتے ہیں۔

ہر روز، ہر روز، زمین بہت سوں کو اپنے سینے میں سمیٹتی ہے۔ پھر جنم نہیں دیتی۔

جو باقی رہ جاتے ہیں، اپنے شہر کی سوختہ قربانیاں بنے، اپنے سینوں کے ساتھ اپنے جذبوں کو سوختہ قربانیوں ہی کی طرح چمٹائے انہیں تھپکیاں دیتے ہیں، دلاسے دیتے ہیں اور اس اور دیکھتے ہیں جہاں شہر کی سب سے حسین کنواری، سر جھکائے مٹی کے ٹیلے پر بیٹھی ہے۔ اس کے لانبے لانبے سیاہ بال اس کے گندمی جسم پر پردہ ہیں جن کے پیچھے وہ اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے سوچ میں گم ہے کہ اسے آئندہ نسلوں کو جنم دینا ہے۔

اس کی کوکھ چھلنی چھلنی ہے۔

اس کی گردن میں ڈریکولا کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں اور سینے پر دو روشن آتش فشاں انار

فرینکن سٹائن کے منہ میں بجھ جاتے ہیں ۔ وہ اٹھتی، گرتی، اٹھتی، اپنی چھلنی کوکھ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے، اپنے ٹھنڈے پسینے میں بہتی شہر کے چوراہے میں آکر ڈھیر ہو جاتی ہے ۔

وہ کہ جو شہر کی سب سے حسین کنواری ہے، جسے آئندہ نسلوں کو جنم دینا ہے ۔

وہ اپنے جسم کو وہیں چھوڑ کر، ستاروں کی چھاؤں میں ہواؤں کی سیاہ ایال کو پکڑتی ہے اور ہوا ہو جاتی ہے، ان کی تلاش میں جو اس سے پہلے گئے تھے ۔

سنسنی خیز خبر!

تو یہ ستم ظریفی ہی تھی کہ اسے دوبارہ جنم دیا گیا ؟ نامکمل جنم، نامکمل صورت حال کی کوکھ سے ؟ کہ آج سے بہت عرصہ پہلے جب وہ اپنی ماں کے بطن میں تھی تو سینے میں اترتے تیروں کی سنسناہٹ اور پیٹھ میں خاموشی سے کھبتے خنجروں کا سکوت پہلی مرتبہ اس نے وہیں سنا تھا ۔

اور اب جبکہ نقشے پر بڑی بے دردی سے قینچی چلائی جا رہی ہے اور اسے عجیب و غریب ناقابلِ شناخت نمونوں میں کاٹا جا رہا ہے اور سارا شہر ماتم کناں ہے کہ وہ بڑی بوڑھیوں کے ریوڑ میں ایک بڑی بوڑھی جیسے کنواری نوجوان ہڈیوں کے زنداں میں ڈال دیا گیا ہے، جس کی رگوں میں ڈریکولا بیٹھے ہیں اور دو آتش فشاں انار چھاتیاں ڈاکٹر فرینکن سٹائن کے منہ میں ۔

پر یہ تو تمھارے جنم سے بہت پہلے ہوا تھا ۔ یہ شہر تمھارے لئے کیا حقیقت ہے ؟

وہ حیران رہ جاتی ہے، میں ؟ تھی، ہوں، رہوں گی ۔ میں بانجھ نہیں ہوئی ۔

جو باقی رہ جاتے ہیں، اپنے شہر کی سوختہ قربانیاں بنے، اپنے سینوں کے ساتھ اپنے جذبوں کو سوختہ قربانیوں ہی کی طرح چمٹائے انہیں تھپکی دلاسہ دیتے شہر کی سب سے جوان، کنواری حسینہ کی طرف دیکھتے ہیں ۔

وہ، سینوں پر تیر اور پیٹھ میں خنجر کھاتے، چوراہوں میں جلتی شمعیں،

وہ شرمسار کنواریوں میں ایک شرمسار کنواری جس کے سر کے لانبے لانبے بال سفید ہو گئے ہیں اور نظر کمزور پڑ گئی ہے ۔ ایسا وقت کہ جو اس کے وقت سے بہت پہلے بیت گیا

میں ؟ ! ہوں، تھی، رہوں گی ۔ میں بانجھ نہیں ہوئی ۔

اس کا بدن چوراہوں میں جلتی شمع، سینے کے انار آتش فشاں، روشنی کے سرچشمے،

اگرچہ اس کے سینے میں تیر اور پیٹھ میں خنجر پیوست ہیں اور کوکھ چھلنی چھلنی

لیکن اس کے سر میں پھیلتی اسمٹتی تیخیوں سے کٹتی گونج سے جڑتی سرحدیں، زلزلہ، آتش فشاں

اناروں کی گونج، ان پر تیروں کی سنسناہٹ اور خنجروں کا سکوت محیط ہوتے کے باوجود۔

وہ ایک ایک کر کے کٹتے، گرتے، زمین کے زخموں میں اترتے سپوتوں، سپوتریوں کو آنکھوں

میں سمیٹے، اپنی چھلنی کوکھ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے، سینے پر پھوٹتے آتش فشاں اناروں کے

لوز میں اس جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ جہاں طلوع ہوتے سورج کی کرنیں ایک ہی رنگ میں

سمٹی نئی دلہنوں کا لباس ہیں، گالوں کی لالی، ہونٹوں کی سرخی اور دلوں میں دھک دھک کی آواز بنے

اپنے آپ سے عہد کیے کہ وہ اس نکھری نکھری شفق رنگی فضا میں، زمین کی مٹی کے ایک ایک

ذرّے سے اپنی کوکھ سے ٹپکتے لہو کی ایک ایک بوند کو حاملہ کرے گی۔

نئے سپوتوں سپوتریوں کا جنم

لیکن یہ خبر کوئی خبر نہیں

دنیا کے غیر جانبدار لفظ، آواز کی صورت، تحریر میں ڈھلے مختلف پیکروں سے اڈتے کہ اس

شہر کو شکست ہوئی کہ ہوئی۔

اور جانبازوں کی تعریفوں میں رطب اللسان

صرف خبر چاہیے۔ نئی سنسنی خیز، ہلاکت کی یا غیر متوقع فتح کی۔

سب طرف امن ہے۔ صورتِ حال قابو میں ہے،

شہر کی رگوں سے پیکروں میں بازگشت۔

اور شہر کے رگوں کے مکیں شہر کے لہو کے نشے میں بدمست نہیں جانتے کہ شہر کی رگیں رفتہ

رفتہ خشک ہو رہی ہیں۔

اور باہر سے حملہ آور افرنگیکن شاہین کے عفریتوں کے، تیر چلاتے ہاتھ اب رفتہ رفتہ شہر کے گرد

مٹھی کی صورت سمٹ رہے ہیں۔ شہر کہ جن کی رگوں میں وہ بھی بیٹھے ہیں کہ جن کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ ہے۔

کب ہوگا؟ کب تک ہوگا؟

نئے سپوتوں، سپوتریوں کا جنم،

(۴)

تہ در تہ مضطرب زندگی سے گدلایا ہوا سمندر، قطرہ تخلیق،

وہ سب اس اکائی کی صورت موجود ہیں،

بچھڑے ہوئے، جابر صدیوں کے سینے میں تلواریں گھونپنے کی خواہش لئے کرب و سوز۔

صدیاں کہ جو گھوڑ سواری کے بوٹ پہنے، اعلیٰ نسلوں کی گھوڑیوں پہ سوار، ان کی ٹانگیں گھوڑیوں

پیٹوں کو اس مضبوطی سے گرفت میں لئے ہیں کہ پیٹ کی گولائی کے ساتھ قوسیں بن گئی ہیں۔

ان کے آباؤ اجداد کو، بھائیوں، بہنوں، ماؤں، بیٹیوں، شوہروں، بیویوں کو پہاڑوں، دریاؤں،

سمندروں، میدانوں، مرتفع سطحوں پہ لئے پھرتی ہیں، جابر صدیاں۔

کرب و سوز تبدیلی کی خواہش ہیں، ان صدیوں کے سینے کی طرف تلواریں سونتے،

بادشاہوں، ملکاؤں، شہزادوں، شہزادیوں کے محلوں میں سرگرداں، ہوا میں پکارتے،

غلام، لونڈیاں، سدا جینے کی خواہش میں ترستے رہیں،

صف بہ صف آگے بڑھتے ہوئے سرگرداں، بادشاہ، آنکھوں میں بجھتے سرابوں کے سنگ تجسم

کی تلاش میں

مرتے ہوئے تنہا،

اور وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوا ظلم، سمندر، اعلیٰ نسل کی گھوڑیاں، صدیاں ان میں

کی قوسیں بن گئی ٹانگوں کی گرفت میں، تاریک۔

کبھی تاریک خلاؤں میں گھنی جھاڑیوں کے بیچ چھپے جگنو، سیاہ زمین پہ شکستہ پتھروں کے

بوجھ کے دبے تنکوں والے کیڑے

روشنی کے چشمے

اور ستارے کہ جنہوں نے انجانے میں اس پُراسرار ارضِ آدم کے نصف کُرّے پر روشنی پھیلائی۔
وہ اپنے بدنوں میں اپنے آباؤاجداد کی برسوں شکستوں کو نیچا دکھاتے لڑتے رہے،
کبھی ہار کبھی جیت۔

وہ گبھرو جوان اور کنواری ایک دوسرے سے جدا، کروموسومز کے درمیان خون تشکیک
اور بے یقینی کی خلیج حائل کر دی گئی ہے، نفرتی علاقائی سازشیں کہ کروموسومز کہیں صدیوں پرانی
لکیروں سے ہٹ کر نئے نمونوں میں ڈھل کر نئے امکانات، نئے پیکروں کو جنم نہ دے دیں جو جابر
صدیوں کے سینے میں تلوار گھونپ دیں،

نیا آدم کہ جو گھٹی فضاؤں میں اُگتی جھاڑیوں کے بیچ چھپے جھینگروں اور سیاہ زمین پر رینگتے
پتھروں کے بوجھ تلے دبے کیڑوں کی نجات بنے۔

گرم زمین اور سرد سمندر نے ان دونوں کو مشترکہ مستقبل سے کاٹ کر اپنی دانست میں ایک
دوسرے سے جدا تو کر دیا ہے پر یہ نہیں جانا کہ شناختی کارڈوں پر گبھرو جوان کے چہرے پر اس کنواری
کی آنکھیں ہیں اور کنواری کا چہرہ گبھرو جوان کے ہونٹ لئے۔

زبان و مکاں سے پرے، وہ پہلے ہی جانتے ہیں کہ جابر صدیوں کا لہو، ہڈیاں، گوشت پوست
ایک ہی ہے۔

تو کیا وہ نمرود ہی نہ تھے جنہوں نے اپنی بقا کے ایمان کو نفرتوں سے داغدار کر کے اپنی سگی
بہنوں کو اپنے ساتھ ہوس اور شہوت کی زنجیر سے باندھا تھا؟ تو پھر گبھرو اور کنواری کے ہونٹ چھینے
اصلی خطوں پر سوار ہیٹ کی گولائی کے گرد قوسیں بنی ہاتھوں والی صدیوں کو کیا شرم کہ وہ بھی
زباں کے لفظوں سے مرے ہیں۔

زبان و مکاں سے پرے، وہ پہلے ہی جانتے ہیں کہ غلاموں، لونڈیوں کا لہو، ہڈیاں، گوشت پوست
بھی ایک ہی ہے۔

تو کیا وہ ابراہیموں کے غلام نہ تھے کہ جو ہوس اور شہوت کے بطنے غلامی اور بیگانگی کی زنجیروں
میں بندھے لوٹے کھاتے تھے اور جن کے بچے بچھڑے ہوئے ماں سے بچتے اور پسینے کے قطرے ان کے
ٹھیکروں میں آگرا ماں کی صورت پھیرتے تھے؟

پر تاریخ میں جلد یا بدیر وہ وقت آ ہی جاتا ہے جب ٹھوکریں کھاتے ہوئے نطفوں میں ایک دوسرے میں زنجیر بنے کروموسومز کی اندرونی قوت سے زنجیریں کمزور پڑنے لگتی ہیں اور کروموسومز اچانک بغاوت کر دیتے ہیں۔ جابر صدیوں کے سینے میں اپنی تلواریں گھونپ دیتے ہیں، تب سارا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ اسے سائنسی زبان میں MUTATION کہتے ہیں۔ یہ بھی ارتقا کی ایک شکل ہوتی ہے، انقلابی شکل۔

تو یکایک اس گھبرو جوان کے وجود سے اچھلتی، تڑپتی، اڈتی لہریں
خشک زمین پر اینٹھتی، تڑپتی، ڈھیلی پڑتی، اینٹھتی، اپنے بدن سے اچھلتی وحشی لہروں میں
اسے وہاں جکڑتی، چھوڑتی، جکڑتی ہے جہاں شہر کا گرداب ہے۔

وہ دونوں، تشکیک لئے یقینی میں طلائی تقرئی سازشوں سے خوفزدہ ہیں۔
پر دیکھو، یہی خوف ان کے جسموں میں بچھڑتے کے خواہشمند طوفانوں کو بھی شہ دیتا ہے،
اور ان دونوں کا یہ ایمان کہ طوفانی لہروں کے نیچے پرسکون گہرائیوں میں سنہری مچھلیاں ان کے لئے گیت گاتی ہیں۔
شہر کا گرداب صدیوں کے جبر کو نگلنے کے لئے بے صبر، نئے شہر کو جنم دینے کے لئے بے قرار۔
سمندر کے رازوں میں تیرتے میرے پاس آؤ کہ میں اور تم ایک دوسرے میں ایک ساحل پر نئے آدم کو جنم دیں۔
——تم اسے زمین پر چلنا سکھاؤ گی اور میں اسے آسمانوں میں طلوع ہونا سکھاؤں گا۔
ننھے منے گول مٹول بچے کی رگوں شریانوں میں، اس کی چھاتیوں میں دھڑکتے دودھ کی دھڑکن، زبان پر وہ ذائقہ جو اس کی چھاتیوں میں سفید ہے پر تمھارے دل میں اتر کے سرخ
وہ گھبرو جوان تلوار سونتے، اپنی ماں کے پستانوں کی تنی بھٹنیوں پہ زبان رکھ کر اپنے اپنے باپ کے لہو کا ذائقہ چکھتا ہے۔
اور گھٹی فضاؤں میں گھنی جھاڑیوں کے بیچ جگنو،
سیاہ زمین پر خشک پتوں کے بوجھ تلے دبے قمقموں والے کیڑے
اور ستارے کہ جنھوں نے انجانے میں اس پر اسرار ارض آدم کے نفرت کرے پر روشنی بچھائی،

تہ در تہ، تہ در تہ، مضطرب زندگی سے گدلایا ہوا سمندر، قطرۂ تخلیق،
وہ سب اس میں اکائی کی صورت موجود ہیں،
بپھرے ہوئے، جابر صدیوں کے سینے میں تلواریں گھونپنے کی خواہش لئے کردمو سوز،
متجسس، جگمگاتے، روشن، نجات کے لئے مضطرب۔

(۵)

رات کا آخری پہر ہے؟

سورج بس طلوع ہونے ہی والا ہے؟

سورج پر اترنے کی خواہش لئے وہ سمندر میں اس اور تیرتی ہے جہاں رات زمین کے قریب تر ہوگی۔

وہ لہروں پر اچھلتی، کودتی، پھلانگتی، لہروں میں اترتی، ابھرتی، تیرتی اس اور رواں دواں ہے۔

اس کے نیچے سمندر کا ابال ہے اور اس کی نازک زرد ٹانگیں تھکن سے چور چور۔

کھردری کھال والا ایک بہت بڑا سمندری اژدر ایک جانب سے اس کی پنڈلی، ران، دھڑ، چھاتی، بازو اور چہرے کو رگڑتا، اپنے دہن سے بھڑکتی آگ کا جھاگ اڑاتا لہر کی اوٹ سے ابھرتا ہے۔ کٹار دانتوں والا، تنومند سامنے کھڑے اس پر جھپٹتا ہے۔

اسی لمحے وحشت، اس کے تھکے، نازک، زرد وجود کو قریبی لہر پر اچھال دیتی ہے۔

سمندر اس کے جسم کی تمام دہشت چوس کر اپنی پوری قوت اس کے وجود میں اتار دیتا ہے اور اپنی جرأت بھی۔

وہ سمندر کی دہاڑوں میں دھاڑتی، بپھر کے پلٹتی ہے۔ قریبی لہر پر پاؤں جما کر پنجوں کے بل اچھلتی ہے اور اپنے ہی زور میں قریب سے گذرتے اژدر پر سوار ہو جاتی ہے۔ آگ پھنکارتے اژدر کی کھردری کھال سے اس کی نازک رانوں کے اندرونی حصے چھل جاتے ہیں۔

بیپسی سدھوا کے لئے تانیا اور ایلیسا ڈیتیارچی سے معذرت کے ساتھ

لہو کے قطرے ابھر آتے ہیں۔ اژدر، گردن گھما کر خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھتا ہے۔ آگ اگلتا ہوا، اسے نگلنا چاہتا ہے۔

— یہ آگ کبھی بجھے گی بھی ؟

— یہ آگ سدا روشن رہے۔

وہ مسکراتی ہے کہ اب پچھلی راتوں میں نمکین سمندر کی آگ ہے۔

وہ اسی دم، سمندر کے پانیوں میں تجھ اپنے بدن سے لپٹے سر کے لمبے سیاہ بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی ہے اور ذرا سا جھک کر سمندری اژدر کے منہ میں لگام دے دیتی ہے۔

اور دیکھو کہ ہوا بجھتا ہے نہ بال جلتے ہیں۔

وہ ایڑ لگاتی ہے۔

سمندر پھولتا ہے، پھولتا ہی چلا جاتا ہے، کنواری حاملہ کے پیٹ کے مانند۔

اور سورج، اتنا بڑا طلوع ہوتا سورج، سمندری اژدر کے دہن کی طرح روشن، سمندر اور رات کے اتصال کو سحر کی صورت چیرتا۔

وہ اور اژدر لہروں پر سوار، سرپٹ سورج کی اور، کہ اب موقع ہے، دوسرا قدم سورج پر ہوگا۔

اور اس سے پیشتر کہ وہ اس کی پیٹھ سے سورج پر چھلانگ لگائے، اژدر اپنا دہن کھولتا ہے، سورج کی قوس میں اپنے کٹار دانت گاڑ دیتا ہے۔

چاروں اور تاریکی چھا جاتی ہے۔

کائیں کائیں کرتی سیاہ رات میں ساحل پر کائیں کائیں کرتے سایوں سے دور، وہ پتھریلی چٹان پر بیٹھی ہے۔ اس کے نازک، زرد بدن کے ایک ایک مسام میں اترتی سرد نمکین ہوائیں، چنگاریاں ہیں۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا۔

سورج پر اترنے کی خواہش لیے وہ اس اور دیکھتی ہے جہاں سمندر اور رات کچھ اس طرح سے گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ افق نظر نہیں آتا، افق کا صرف گمان ہوتا ہے۔

وہ سوچتی ہے،

تو رات آج بھی زمین کے قریب تر ہے۔ اتنی روشنی کب ہو گی کہ گھر جانے والے راستوں کی شناخت ہو سکے۔

(۶)

اگران چھاتیوں میں دودھ ہوتا تو یہ مری ہوئی چھپکلیوں کے بجائے دو گرم دھڑکتی کبوتریاں ہوتیں۔

پر تب وہ ماں ہوتی، جوان، خوبصورت، نکھرا نکھرا بدن،

اور اس وقت توڑی کے ڈھیر کی اوٹ میں بیٹھی اپنے گل گوتھنے بچے کو

گود میں لئے، اپنی چھاتیوں میں گندم سے اترتی دھوپ پلا رہی ہوتی۔

لیکن وہ ماں نہیں

ماں بن نہیں سکی، بن سکتی نہیں

کہ سعولوں نے عاملوں کو یہی لوک تشکل دی ہے جو مقام، زمانے اور تہذیب کے حوالے سے تو بدل جاتی ہے، پر اپنی روح میں وہی رہتی ہے۔

حلق سے پھنس پھنس کر نکلتی مکارانہ ہنسی والی عورت

جادوگرنی

پچکے گال، شر سے بھری مکار آنکھیں اندر کو دھنسی، ہونٹ بھینچے پتلی سی لکیر، جن پر جھکی خم دار ناک، ٹھوڑی باہر کو نکلی، خشک بجھے بجھے بدرنگ بالوں والے سر پر سیاہ مخروطی ٹوپی، جسم پر سیاہ چغہ جس کے نیچے پنجر پہ سفید چمڑی منڈھی ہوئی اور چھاتیاں، مری ہوئی چھپکلیاں، جو اپنی اس مغربی کلاسیکی صورت میں اس جھاڑو کو نقل و حرکت کے لئے استعمال کرتی ہے جس کی ہتھی میں ایک لمبا سا بانس ٹھکا ہے۔ وہ اس بانس کو اپنے چڈوں میں لے کر، اس پر سوار، جہاں چاہے، جب چاہے، جا سکتی ہے۔

جادو کی کنکریٹ صورت، عامل کہ اپنے کمپیوٹروں کی ہدایت پر اس ہیئت میں یوں اس لئے

رچ بس گئے ہیں کہ یہ ان کا جادو ہے جو معمول کی کمزور شخصیت کو جیسے چاہے ڈھال لے۔
پر جب معمول کی کمزور شخصیت، اندرونی بیرونی طوفانوں کے تھپیڑے کھاتی رفتہ رفتہ فولادی
صورت اختیار کرنے لگتی ہے تو اسی رفتار سے جادو کا اثر بھی زائل ہونے لگتا ہے۔ بالآخر
معمول، معمول نہیں رہتا بلکہ ہر قسم کے جادو سے آزاد انسان۔

تو دنیا میں اس کا جادو رفتہ رفتہ بے اثر ہو رہا ہے
بے اثر ہو چکا ہے۔

اگر اس کی چھاتیاں مری ہوئی چھپکلیاں نہ ہوتیں
اگر ان میں دودھ ہوتا تو اس کا بدن نکھرا نکھرا جوان ہوتا اور وہ اس وقت تُوڑی
کے ڈھیر کی اوٹ میں اپنے بچے کو اپنی چھاتیوں میں گندم سے اتری دھوپ پلا رہی ہوتی۔
پر اب وہ نیشنل پارک کے ایک کونے میں خشک جھاڑیوں کے نیچے گھاس پر پڑی ہے
تھکی ہاری، کانپتی لرزتی،

اس سے ذرا دور ہٹ کر خود رو جنگلی پھول ہولے ہولے بہتی ہوا میں جھومتے ہیں۔
وہ دل برداشتہ، ہولے ہولے بہتی ہوا میں جھومتے خود رو جنگلی پھولوں سے نظریں ہٹا
لیتی ہے اور جھاڑو کے بانس کو اپنے جبڑوں میں بھینچے، بانس کو اضطراری ہاتھوں میں تھامے
ہیجان میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

شاید مدتوں سے اس جھاڑو کو اپنے جبڑوں میں دبا کر معمولوں کے آسمانوں سے زمین
پر اترتے سونے کو سمیٹتی اڑتی اترتی، اڑتی تھک چکی ہے۔

وہ تو برگ تخیل کی طرح ان تھک تھی۔

تو پھر یقیناً نیشنل پارک کے آسمانوں میں جادوگری اور جھاڑو کے درمیان سچائی کا لمحہ
بیت گیا ہے۔ حقیقت کا انکشاف کہ وہ دل برداشتہ ہو کر تخیل سے کٹی پتنگ کے مانند
نیشنل پارک کے اس کونے میں آ گری ہے، گھاس پر، خشک جھاڑیوں کے نیچے کہ جن سے
ذرا دور ہٹ کر خود رو جنگلی پھول ہولے ہولے بہتی ہوا میں جھومتے ہیں،
اور ذرا اور پرے، سیر کرتے ہر رنگ ہر نسل کے لوگ لاتعداد عورتیں، بچے، مرد، جوان

کبوتروں کو دانہ ڈالتے، جھیل میں بطخوں کو تیرتا دیکھتے، نوجوان جوڑے ایک دوسرے کی کمر
میں بازو حمائل کئے، نسبتاً تاریک گوشوں میں ایک دوسرے سے بغلگیر، ایک دوسرے کے
ہونٹ چومتے ہوئے
ہوس کی اس متروکہ پوٹلی پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔
سبھی نے مجھے چھوڑ دیا۔؟ عاملوں نے بھی؟ نہیں یہ ناممکن ہے۔
کہ نوک تخیل نے عاملوں کو ان کی تخیلی صورت کے ساتھ اتنا کنکریٹ کر دیا ہے کہ اب
وہ سب، کمپیوٹروں کی ہدایت پر اس کے وجود میں اکائی کی صورت سمٹے نیشنل پارک کے
اس کونے میں خشک جھاڑیوں کے نیچے جھاڑو کے بانس کو جذبوں میں بھینچے ہیجان میں مبتلا
ہیں اور ان سے ذرا دور ہٹ کر ہولے ہولے بہتی ہوا میں جھومتے خودرو جنگلی پھول،
سوال کا کوئی جواب نہیں کہ اب کمپیوٹر بھی گنگ ہیں،
کہ معمول اب اندرونی بیرونی طوفان میں ڈھلے، ہر قسم کے جادو سے آزاد انسان ہیں۔
وہ روہانسی ہو جاتی ہے کیونکہ اب تو اس کا بدن بھی ہیجان میں ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھیلا پڑ
گیا ہے،
پرانی بوسیدہ کاروں کی طرح، متروکہ کاروں کے قبرستان میں،
ہو سکتا ہے یہ سکریپ بھٹیوں میں پگھلتا، کٹھالیوں میں ڈھلتا کوئی اور شکل اختیار کر لے
پر وہ مادہ نہیں،
ماں نہیں، بن نہیں سکی، بن سکتی نہیں
وہ مادہ نہیں،
مجرد ہے۔
ایک چھوٹی سی لڑکی جس کا بدن نکھر اٹھا ہے، جس کے منہ سے اس دودھ کی خوشبو
آتی ہے جو گندم سے اترتی دھوپ ہے، جانگیہ پہنے نیشنل پارک میں سیر کرتے لوگوں سے
ٹوٹ کر پریوں کی تلاش میں اس اور نکل آئی ہے۔
وہ اسے اس کونے میں خشک جھاڑیوں کے نیچے گھاس پر دیکھتی ہے، بے حس و حرکت۔

اس میں کوئی حرکت نہ پاکر وہ چھوٹی سی لڑکی ڈرتے ڈرتے، اپنے ڈر پر قابو پانے کی کوشش کرتی، زمین سے پتھر اٹھاتی ہے اور اپنی پوری قوت سے اس کی چھاتیوں پر دے مارتی ہے لمحہ بھر اسے دیکھتی ہے پھر کھلکھلا کر ہنستی اس سے ذرا دور ہٹ کر، ہرے ہرے بہتی ہوا میں جھومتے خودرو جنگلی پھولوں میں پریوں کو تلاش کرنے لگتی ہے۔

پتھر کی چوٹ سے، مری ہوئی چھپکلیوں میں سے ایک کی سفید چمڑی پھٹ جاتی ہے۔
زخم سے دودھ تو کیا لہو کا بھی قطرہ تک نہیں بہتا۔

وہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں کو پوری شدت سے بھینچ لیتی ہے کہ شاید ایک آدھ آنسو ہی ٹپک پڑے۔

...

لیکن یہ نعمتیں تو انسان کو ودیعت کی گئی ہیں۔

حیرت ہے

ظالم کا چہرہ کتنا بھی مظلوم کیوں نہ دکھائی دے، اس پہ کندہ ظلم کی تحریر کبھی نہیں مٹتی جادو سے آزاد انسان اس تحریر کو پڑھ کر ہمیشہ کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔
اور ذرا دور ہٹ کر، ہرے ہرے بہتی ہوائیں جھومتے، خودرو جنگلی پھولوں کی اور ہو لیتے ہیں۔

(۷)

جب ان کی نظریں اس کی اور نہیں پڑتیں
اس کے دونوں بازوؤں، ٹانگوں، ہاتھوں پیروں میں سوئیاں چبھنے لگتی ہیں۔
اور پھر سب کچھ بے جان سا ہونے لگتا ہے تو
یہ محسوس کرنے کے لئے کہ جو اشیاء اسے گھیرے میں لئے ہیں
زندہ ہیں، زندگی کی حدت لئے
وہ مزار کی دہلیز کو چومنے کے بعد سب کی نظروں سے چوری
اگرچہ اسے نظریں چرانے کی ضرورت نہیں
سنگِ مرمر کی بنی محراب کے ستون پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتا ہے
سب ہی اسی طرح اپنے ایقان کو سہلاتے ہیں
بے ضرر حرکت
سنگِ مرمر سے بنی محراب کے اندر قبر، تعویذ، اچھاڑ، گنبد کی چھت میں جڑے لاتعداد چھوٹے
چھوٹے آئینے،۔
درون کے لاتعداد عکس
وسط سے لٹکتا فانوس
دہلیز کے پار جانے کی اجازت نہیں۔ محراب میں شیشہ لگا ہے،
سب کچھ شوکیس کے اندر

ایک عرصہ ہوا ہر شے اس سے اکتا چکی ہے، اس کی شاعرانہ یاد بننے تک سے انکار کر چکی ہے۔ بچپن ہی سے وہ ان کی رفاقت کے لئے کوشاں رہا ہے، ترستا رہا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے اندر جذب کر سکے۔ زندگی۔ جونہی وہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے ہاتھ سے سہلاتا اس پر گرفت مضبوط کر کے اپنے سینے میں اتارنا چاہتا ہے تو جیسے کوئی اس شے کو وہاں باندھ کر اس کے ہاتھ کو بے جان کر دیتا ہے۔ اب وہ اپنی اس کیفیت کا ذکر کسی سے نہیں کرتا، حتیٰ کہ ڈاکٹر سے بھی نہیں۔ سب کہتے ہیں، یہ اس کا وہم ہے۔ اس کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا، وہم کیا ہوتا ہے اور حقیقت کیا۔

سو اس کے اور کھلونوں کے درمیان، سہولتوں، ضرورتوں اور اس کی محبوبہ کے درمیان، اس کے اور زندگی کے درمیان شیشے کی دیوار حائل

سب کچھ شوکیس میں

وہ شیشے کے ساتھ آنکھیں چپکائے، ناک چپٹی

وصل۔ وسائل،

سوئیوں کی چبھن، بے حسی اس کے بازوؤں، ٹانگوں، ہاتھوں پیروں میں رقم

شوکیسوں میں ڈمیاں

گنبد کی چھت سے منعکس ان گنت خواب

تا آنکہ کوئی ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دے۔

——خواہشوں کی تجسیم کو اپنے میں کیسے جذب کروں

دہلیز پہ پڑے

وہ سر، بازو، ٹانگیں سمیٹ کر خول کے اندر سمٹ جاتا ہے

ایک ایک کر کے اس کی سب خواہشیں مٹ چکی ہیں، مٹا دی گئی ہیں۔ وہ اس کی خواہشوں گویا وہ اپنی خواہشوں کو مٹانے میں کامیاب ہو چکا ہے جیسے ٹائپ کرتے ہیں غلط لفظ کو اس مہارت سے مٹا دے کہ لفظ کا نشان رہے نہ مہین کاغذ پھٹے۔ صرف ایک خواہش ہاتھوں، نظروں کے لمس سے اشیاء کو محسوس کرنے کی کہ جس گھیرے میں ہے، زندہ ہے؟

زندگی کی حدت لئے ؟ جذب نہ سہی، زندگی نہ سہی، احساس ہی سہی۔

اس کی اتنی معمولی سی خواہش کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ؟

وہ جو اسے جانتے ہیں اور وہ جو اسے نہیں جانتے اور وہ جو اسے جانتے ہیں پر نہیں جانتے، اس سے نالاں نہیں۔ وہ بے حد بے ضرر ہے۔ پر بعض اوقات وہ اس کی اتنی امن پسندی، فرمانبرداری بے نیازی سے بولا جاتے ہیں۔ اس کی یہ بے حسی ان کے رونگٹوں میں گھبراہٹ، انجانے خوف کی لہر بن جاتی ہے۔

کون جانے، شوکیس میں شیشے ہی توڑ گئے ہیں۔ اور پہرے دار ؟ کیا معلوم وہ کس ہتھیار سے انہیں مغلوب کرلے

بہت سی سرد راتوں میں ایک رات

حسب معمول وہ مزار سے باہر آتا ہے

ویران سڑکیں، شوکیسوں اور بجلی کے کھمبوں سے لٹکتے، دھند کو چیرتے تیز نوکیلے نشتر

وہ شوکیسوں میں زرق برق پوشاک پہنے، مصنوعی زیورات سے لدی پھندی ڈمیاں دیکھتا ہے

کھلونے، محراب کے مرمریں ستون، شیشہ، خواہشیں

زندگی ہے۔ حدت ہے۔ نظروں سے چھوؤ۔ دہلیز پار کرنے کی اجازت نہیں

گنبد کی چھت میں ان گنت دعائیں منعکس، وسط سے لٹکتے فانوس میں الفاں روشن

ڈمیوں کی راتوں میں خوابوں کا ساعت انزال

آنکھیں شیشے کے ساتھ چپکی، ناک چپٹی

پار آنے کی کوشش نہ کرنا، حوالۂ پولیس کر دیئے جاؤ گے۔

دور سے قریب آتی گشت کے سپاہیوں کی للکار، سیٹیاں۔

وہ انتہائی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ بھاگنے لگتا ہے کہ اتنی سرد راتوں میں سڑک پر آنے والا ہر شہری ان کی نظروں میں مشکوک ہے۔

وہ بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہے
کسی شریف شہری کو کیا پڑی ہے کہ آتنی سرد اندھیری رات میں سڑکوں پر مارا مارا پھرے۔
آوارہ کتے بھی ایسے تاریک موسم میں تھڑوں کے نیچے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔
وہ بھاگتا ہے۔ بھاگتا ہے۔ خوفزدہ کتے کی طرح
بازو پر گرفت، کمر پر ڈنڈا، ہر سوال کا جواب ان کے نزدیک جھوٹ۔ تھانہ، چھتروں سے
تواضع، تا آنکہ ناکردہ جرم کا اقرار یا سرکار کو غیر سرکاری جرمانے کی ادائیگی
بھاگتے بھاگتے، پسینہ، حدت، زندگی، کسی بھی شے کو نظروں سے چھوٹے بنا ہی اس کے
سارے وجود میں لبالب بھر جاتی ہے۔
اس کا مثانہ پیشاب سے پھٹنے لگتا ہے۔

وہ پھولے سانسوں سے، ایک دیوار کی اوٹ میں رک کر جلدی جلدی اپنی بوسیدہ
جین کی پتلون کے سامنے کے بٹن کھولتا ہے۔

لیکن وہاں کچھ نہیں۔
وہ حیران پریشان رہ جاتا ہے
پیشاب رکنے نہیں پاتا۔
سپاہیوں کی سیٹیاں، للکار قریب، اور قریب
چاک میں انگلیاں دیوانہ وار تڑپتی ہیں، وہاں کچھ نہیں۔
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔
اشیا جو موسموں کے تغیر و تبدل کے وار سہتی ہیں، استعمال میں نہ آنے کے باعث
رفتہ رفتہ بالآخر مٹ جاتی ہیں، اپنے آپ کو فراموش کر دیتی ہیں، یادوں سے حذف
بھاگتے فل بوٹوں کی گونج
وہ اسے اپنے حصار میں لے لیتے ہیں
اس کی ٹانگوں، پیروں، بازوؤں، ہاتھوں میں جیسے نشتر چبھتے ہیں، سب کچھ سُن، بے جان

ہو جاتا ہے۔

عجیب بات ہے۔ لمحہ بھر کے لئے، صرف لمحہ بھر کے لئے، زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی تمام حیات کے بکھرنے پر آخری خیال اس کے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کیا ہوا اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں، اس کے ہاتھ تو ہیں، پیر تو ہیں، وہ اپنے گھونسوں، ٹھوکروں سے شو کیس توڑ سکتا تھا۔

وہ چکرا کے گر پڑتا ہے، اپنے پیشاب کے تالاب میں
مسکراہٹ اس کے مفلوج ہونٹوں پر نہیں آتی
وہ بند ہوتی آنکھوں سے دیکھتا ہے
چاروں اور دھند ہی دھند، جس میں
گنبد کی چھت میں جڑے چھوٹے چھوٹے بالتعداد آئینوں سے منعکس ان گنت خواہشیں
وسط سے لٹکتے فانوس میں روشن ایقان
سنگِ مرمر کے ستونوں سے بنی محراب میں لگے شیشے کے اس پار
لوبان کے دھوئیں میں پھیلتی دعائیں
شو کیسوں میں زرق برق پوشاکیں پہنے، مصنوعی زیوروں سے لدی پھندی ڈمیاں
"۳۶ - "۲۴ - "۳۵ ¾
ناپ تول کا آئیڈیل نظام
شیشے کی دیوار کے پار
موسموں کی دستبرد سے محفوظ؟
بے جان
پیشاب میں تیرتی لاش

(۸)

سب ہڑبڑا کر جاگ اٹھتے ہیں، کمرے کا بلب روشن کرتے ہیں
اس کے بستر کی طرف تیزی سے جاتے ہیں
——— وہ۔ وہاں۔ وہ۔ وہ۔ وہاں
وہ چیختی ہے۔ سب بستر کی چادریں اٹھا کر دیکھتے ہیں
پلنگ کے نیچے، الماریوں کے پیچھے، دروازوں کی اوٹ میں، پڑچھتیوں پر
تمام کونے کھدرے کھنگال دیتے ہیں
——— کوئی نہیں مُنّی۔ کچھ نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہے
کونوں کھدروں، چادروں کی سلوٹوں سے، دروازے کی اوٹ، پڑچھتیوں
پلنگ کی کوکھ سے نکل کر پھیلتے سائے
سمٹ کر بجھ جاتے ہیں
شی۔ سنو۔ سنو
سب دم سادھ لیتے ہیں۔ سناٹے کی اپنی بھی کوئی سرگوشی نہیں
روشنی میں سب کچھ بے ضرر،
وہ مسکراتی ہے
کپڑے سے بنے اپنے ہی قد کاٹھ کے گڈے کو فرش سے اٹھا کر

اپنے سینے سے لگا لیتی ہے
اسے اپنے جسم کی حرارت دے کر اپنے وجود میں سمیٹتی ہے

وہ یکدم اٹھ کر بستر میں بیٹھ جاتی ہے
چیخ چیخ کے سب کو اکٹھا کر لیتی ہے
وہ آتے ہی کمرے کا بلب روشن کرتے ہیں، کونوں، کھدروں میں نظریں دوڑاتے ہیں
پلنگ کے نیچے، بستر کی سلوٹوں میں، دروازوں کی اوٹ
بلب کی روشنی میں ہر شے واضح
نظر، روشنی سے ہے
اس کی آنکھیں تاریک
سایوں کی سازشیں، سرگوشیاں، اندھیرے میں ملفوف

اب وہ خود ان کے لئے راہ ہموار کرتی ہے، اٹھ کر کمرے کا بلب خود روشن کرتی ہے کہ تاریکی
میں ان کی متلاشی انگلیاں بھٹکتی نہ رہیں
لیکن کہیں بھی، کچھ بھی تو نہیں، ہراساں ہونے کی کوئی وجہ نہیں
سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، اپنی اپنی جگہ پر
وہ ہر شے کو شناخت کر کے اسے دکھاتے ہیں۔ اسے قائل کرتے ہیں کہ سب کچھ جانا پہچانا ہے
کچھ بھی اجنبی نہیں
وہاں کچھ بھی تو نہیں
اتنے ہاتھ، اتنے مضبوط ہاتھ تو بڑے سے بڑے لرزتے تاروں کو ساکت کر دیتے ہیں
لیکن اس کے جسم میں یہ کپکپی کیسی ہے کہ تھمتی نہیں

گوشت پوست سے بنے اپنے ہی قد کاٹھ کے گڈے کی بانہیں اسے سمیٹ لیتی ہیں
بے جان گوشت کا گُڈا ۔ سرد ۔

لمحہ بھر کے لئے اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ہمت آگئی ہے
انہوں نے اس میں لگی کھنگیوں کو رفو کر دیا ہے
لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی ٹانگیں اور بازو بھاری ہو جاتے ہیں جیسے ایک ہی جگہ
پڑے سونے لگے ہیں ، کسی کے انتظار میں
وہ یک لخت سمٹ جاتی ہے
اس کی آنکھیں سامنے مرکوز ، متلاشی نظریں دیوار کے اندر بندھی ، ساکت
سرگوشیاں
مرے ہوؤں کے پچھتاوے ، رحمت کے فرشتے کے پر
خواہشوں کی سازشیں
سرگوشیاں کمرے کے اندر ، باہر کھلے تاریک آسمان میں
سائے
وہ کھڑکی بند کر کے چیختی ہے
وہ اس کے گال ہولے ہولے تھپتھپاتے ہیں ، اس کے کندھے جھٹکتے ہیں ، اس کی ناک
کو انگلی اور انگوٹھے میں پکڑ کر دبا دیتے ہیں ۔
سانس
وہ اچانک منہ کھول دیتی ہے ، بظاہر دیوار سے نکل کر ان میں لوٹ آتی ہے
جب وہ اسے جھاڑ پونچھ کر ، رفو کر کے ایک بار پھر ٹھیک ٹھاک اس کی مرمت کر کے چلے
جاتے ہیں
تو ایک مرتبہ پھر اس کے ایک ایک مسام میں

چھوٹے چھوٹے خانوں میں، درازوں میں کہ جنہیں انہوں نے اپنی دانست میں ابھی ابھی کھول کر دیکھا تھا، جن میں انہیں کچھ نظر نہیں آیا تھا اور جنہیں وہ اسی طرح بند کر کے چلے گئے ہیں، پسینے کے قطرے لرزتے ہیں، رگیں کانپ جاتے ہیں

کبھی کبھار جب وہ انگلی اور انگوٹھے میں اس کی ناک کو پکڑ کر دباتے ہیں اور سانس کی خواہش میں اس کا منہ اچانک کھل جاتا ہے تو اس کی آنکھیں بھی حرکت میں آجاتی ہیں

چاروں اور لاتعداد گھورتی آنکھیں

ہر آنکھ شہزادے کی

خاوندی کا دعوےٰ لئے اس کی کوکھ پر ثبت جیسے حجری نقوش

وہ اپنے خاوند کی شناخت کیسے کرے ؟ دیواروں میں چنی نظریں

وہ سوچتی ہے :

کیا دیواروں میں چنی نظروں کو چھڑانے کے لئے دیوار کو ڈھا دینا ضروری نہیں ؟

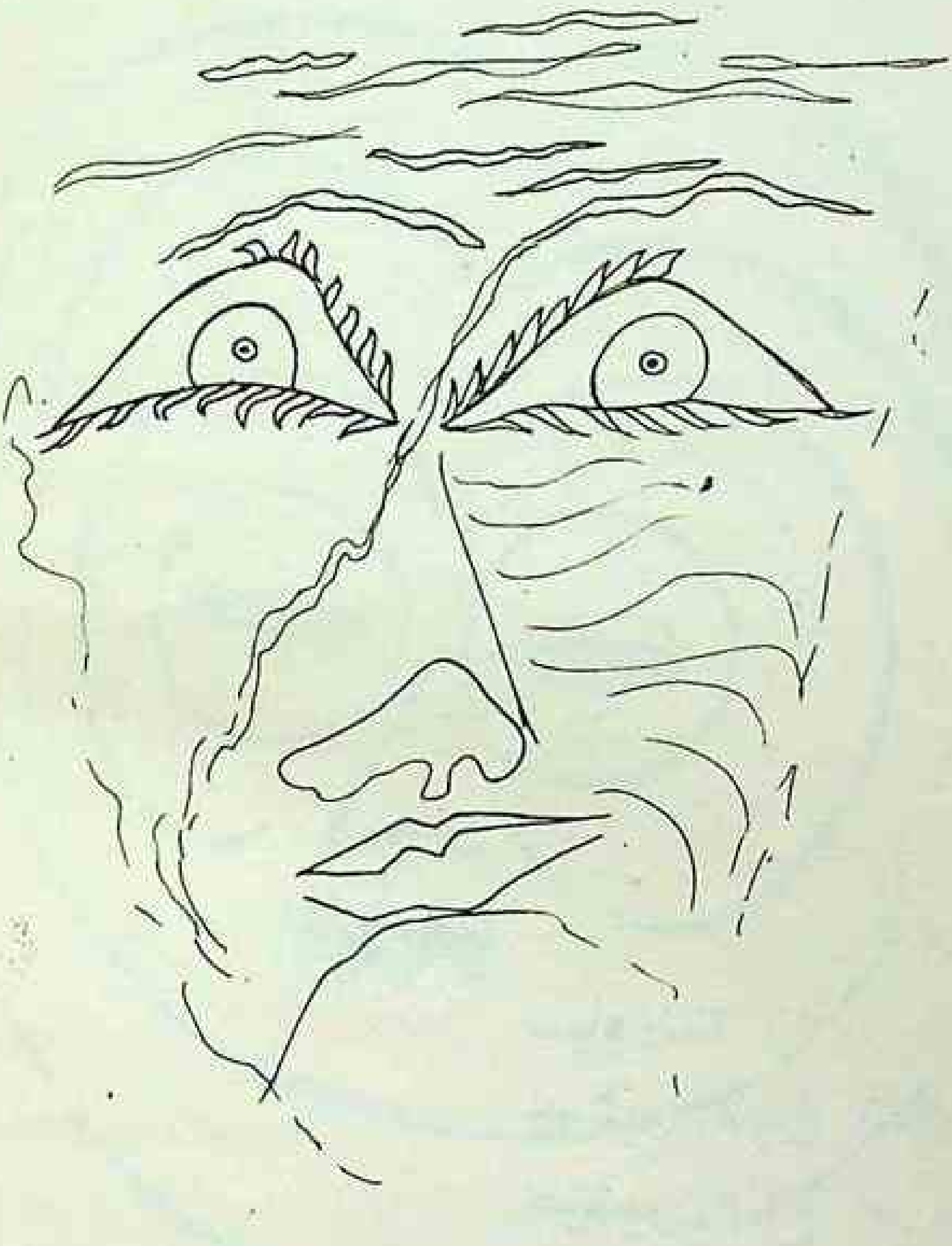
تاکہ گود خوابوں سے ہری ہو ؟

وہ سوچتی ہے - ایک بار پھر خوف سے کپکپانے لگتی ہے

سارا عذاب یہیں سے شروع ہوتا ہے



سیاہ رات
خوشیوں کا باغ ۱—۲
خوشیوں کا باغ ۳



سیاہ رات

سیاہ رات

سیاہ گھوڑے پر سوار، انسانی پنجر، سینے پر اعلیٰ کارکردگیوں کے تمغے، آنکھوں کی جگہ خلاء، جو ان میں جھانک کر دیکھتا ہے۔ وقت اس کے لئے رک جاتا ہے۔ ہونٹ نہ ہونے کے باعث دانت مسکراہٹ، طنزیہ مسکراہٹ میں پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ کھوپڑی پر ٹکی سیاہ چادر جو فضا میں لہراتی اٹک گئی ہے۔ پنجر کی گود میں ڈھول جسے بجانے کے لئے پنجر کا ہاتھ انسانی بازو کی ہڈی تھامے فضا میں اٹھا ہے، ڈھول پر پڑتا ہے، دھم۔ پھر اٹھتا ہے پھر پڑتا ہے۔ دھم۔ گھوڑے کے خراماں خراماں اٹھتے پڑتے سموں سے ہم آہنگ آواز، سر پٹختے سیاہ آسمان کے گنبد میں ٹکرا کے رفتہ رفتہ واپس آتی ہے، دل کو پکڑ کے اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ دھم، ہولناک، جسم کے رونگٹوں میں سنسنا جانے والی جو فضا میں تحلیل ہونے کے باوجود کانوں کے پردے پر یوں تھرکتی رہتی ہے جیسے ڈھول کے پردے پر ہڈی کی چوٹ۔

سیاہ رات

جس کے پیش منظر میں سیاہ گھوڑے پر سوار، کھوپڑی پر سیاہ چادر لئے انسانی بازو کی ہڈی سے ڈھول بجاتا انسانی پنجر جو ہڈیوں کی فاسفورس سے دمکتا باقی اشیاء کے خطوط بناتا ہے۔ سیاہ چادر کے اڑتے پلو کی اوٹ میں تاریک جنگل، بانس، تاڑ اور ناریل کے قد آور درخت، برسی ہوئی بارشوں اور جنگلوں میں گھومتے جانداروں کے سانسوں سے

HANS HOLBEIN, THE YOUNGER: BLACK DEATH (1530)

بوجھل۔ ٹوٹے ہوئے بھیگے پتوں سے جھانکتے لالہ کے سرخ سرخ پھول جن کی پتیوں پر گرے بارش کے آخری قطرے۔ کبھی کبھی ساکت آسمانوں میں بجلی کی لہریں لشک جاتی ہے کہ اس منظر کو آنکھوں میں بچھتے ذرا دیر لگتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اب نظر نہیں آتا کہ اس سارے منظر پہ پنجر کی کھوپڑی پر ٹکی سیاہ چادر کا فضا میں لہراتا پلو پڑا ہے۔ جہاں یہ پلو ختم ہوتا ہے وہاں سے کھوکھلے سینے پہ اعلیٰ کارکردگیوں کے تمغے سجائے، سیاہ گھوڑے پہ سوار، انسانی بازو کی ہڈی سے گود میں پڑا ڈھول بجاتے پنجر کا پس منظر دکھائی دیتا ہے۔

سیاہ رات

جس کے افق پر پھیلی سرخ، نارنجی روشنی میں جلتے بجھتے گھر، جلتی لاشوں کی بو میں ملی بارود کی بو، بچوں، عورتوں کی دلدوز چیخیں تڑاتڑ چلتی گولیوں کی آواز، دھماکے، مرتے جوان، بوڑھوں، بچوں، عورتوں کے آخری سانس، ان سب کو نگلتی، اگلتی، نگلتی، انسانی پنجر کی گود کے ڈھول کے پردوں سے اٹھتی انسانی ہڈی کی چوٹ۔ دھم ہولناک، دلدوز، پراسرار تالابوں میں پھیلی جل کنڑی۔

پھر جب سیاہ گھوڑے کا سوار، اپنے استخوانی ہاتھ میں پکڑی انسانی بازو کی ہڈی سے گود میں رکھا ڈھول بجاتا آگے بڑھ جاتا ہے تو بچوں، بوڑھوں، عورتوں، نوجوانوں کی چیخ و پکار، آہ و بکا رفتہ رفتہ پراسرار تالابوں کی تہوں میں اتر جاتی ہے۔ اب وہ دم سادھے اپنے گھروں کے گرد کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گھر جلتے دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں آس پاس بکھری، چاہتے والوں، چاہے جانے والوں کی لاشیں چمکتی بجھتی ہیں۔ عورتوں کے سینے کے ساتھ چمٹے، دم سادھے بچے اور پھٹے جزدانوں میں محفوظ صحیفے، دم سادھے ہوئے، مردوں کے سروں پر کاندھوں پر گھر کے بچے کھچے بھانڈے ٹینڈے۔ بہت سوں کے پاس ایک ہی قسم کے کیلنڈروں سے کاٹ کر فریم کی گئی تصویر، جسے وہ اپنے سینوں سے نکلتی آہ کو مسکراہٹ میں ڈھالنے کے لئے اپنے سامنے کر کے دیکھ لیتے ہیں، جلتے گھروں، جلتی بجھتی جلتی لاشوں کی روشنی میں، ناتواں باوقار چہرہ، چھوٹی، زیرک، دوررس، عمیق، پیغمبرانہ بولتی آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹوں پہ

خفیف سی، ہر بات کو سمجھنے والی مسکراہٹ جو اَب عورتوں کے سینوں سے چمٹے بچوں، صحیفوں کی طرح ہے کہ زندگی کرنے کے وہ راز جو ان کے صحیفے کی پاتالوں سے نکل کر تصویر والے کی زبان پر آئے تھے اور انھوں نے سنا تھا، سمجھا تھا اور ایمان لا کر اپنی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں۔ آج اعلان کر چکے ہیں کہ اپنے سروں پر پھیلے آسمان اور پیروں تلے پھیلی زمین کے مالک ہیں، بمع ان میں چھپی نعمتوں کے کہ مالکوں کے مالک نے انہیں ان نعمتوں کا مالک بنایا بمع آسمانوں اور زمینوں کے اور یہ باور کرایا کہ کوئی انسان ان کا آقا نہیں، وہ کسی کے غلام نہیں۔

تو ہوتا یوں ہے کہ جب لوگ اپنی کنواریوں کے بدنوں سے پھوٹتی چاندنی، اپنے پراسرار پانیوں کا نیل، اپنی زمین کی سوندھی سوندھی باس، پھولوں کی توس قزح کو رہن رکھنے سے انکار کر دیتے ہیں تو سات سمندر پار سے درآمد شدہ برش اپنی مقامی تیلیوں کے ہاتھوں مصوری کے ایسے ہی شاہکار تخلیق کرواتے ہیں جس میں پس منظر اور سیاہ چادر کے پلّو کی اوٹ کے مناظر زمانے، موسم، آب و ہوا اور حدودِ اربعہ کے مطابق بدلتے رہتے ہیں لیکن پیش منظر وہی رہتا ہے،

سیاہ رات

سیاہ گھوڑے کا سوار، کھوپڑی پر سیاہ چادر لیٹے، انسانی بازو کی ہڈی سے ڈھول بجاتا۔ انسانی پنجر جو اپنی ہڈیوں کی فاسفورس سے دمکتا باقی اشیاء کے خطوط بناتا ہے۔

سیاہ رات

جس کے افق پر پھیلی سرخ، نارنجی روشنی میں جلتے بجھتے گھر

دور، ہزاروں میل دور، ہزاروں صدیاں دور

سیاہ رات

کنواریوں کے حجروں میں چاندنی سو چکی ہے۔ گہری نیند کے سانسوں ایسی ہوا میں جھولتی گندم کی سنہری بالیاں اور سرسوں کے پیلے پھول، شرینہ، کیکر، شیشم کے پیڑوں میں اونگھتی گگھیاں کبھی کبھار چونک کر ایک آدھ بار گگو کو کر دیتی ہیں، ان کی مندی آنکھوں

میں ہزاروں صدیاں پہلے، ہزاروں میل دور سے نظر آتی جلتے گھروں کی روشنی، بچوں عورتوں کی چیخ پکار، کنواریوں کے بدن سے پھوٹتی چاندنی، پراسرار پانیوں کا نیل، زمین کی سوندھی سوندھی باس اور پھولوں کی قوسِ قزح لمحہ بھر کے لئے جاگتی ہے۔

وہ افق پر پھوٹتی روشنی دیکھتے ہیں، جلتے مکانوں کی لو۔

وہ سوچ میں ڈوبی نظریں دیواروں کی اور کرتے ہیں جن پر ان ہی ایک سے کیلنڈروں سے کاٹ کر فریم کی گئی تصویر لٹکتی ہے جس کا چہرہ ناتواں، پُر وقار ہے۔ آنکھیں چھوٹی، زیرک، دوررس، عمیق، پیغمبرانہ، بولتی ہوئی اور پتلے پتلے ہونٹ، جن پر خفیف سی مسکراہٹ، ہر بات کو سمجھنے والی۔

پھر ان کی نگاہیں پڑچھتیوں پر پڑتی ہیں جن پر وہی صحیفے پھٹے پرانے جزدانوں میں محفوظ ہیں جن کی پاتالوں سے زندگی کرنے کے راز نکل کر تصویر والے کی زبان پر آگئے تھے۔

آج انہوں نے سنا ہے، سمجھا ہے اور ایمان لائے ہیں۔

افق پر پھوٹتی روشنی، جلتے گھروں کی لو

—— نہیں۔ یہ تو سورج کے طلوع کا اعلان ہے۔ سرخی کی پہلی لکیر۔

اچانک فضا گونج اٹھتی ہے۔ دھم۔ جیسے ڈھول پر پڑتی انسانی ہڈی کی چوٹ، سر پہ تنے آسمان کے گنبد سے ٹکرا کے رفتہ رفتہ زمین پہ اترتی ہے۔ دھم۔

لوگ چونک کر گھروں سے باہر نکل آتے ہیں۔

بچے کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔ ایک بچے کے ہاتھ میں انسان کے بازو کی ہڈی ہے جو ہزاروں میل دور سے ہزاروں صدیاں پہلے آکر یہاں کے قبرستان میں دفن ہوا تھا۔

دھم۔

ہڈی کی چوٹ لکڑی کے کھوکھے پر پڑتی ہے۔ بچے کھلکھلا کر ہنس دیتے ہیں۔ وہ بچے کے ہاتھ سے ہڈی چھین لیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں اس ہڈی کی فاسفورس کی دمک میں ہزاروں صدیاں پہلے، ہزاروں میل دور، جلتے گھروں کی روشنی، جلتی بجھتی لاشوں کی بو میں رچی بارود کی بو، کنواریوں کے بدنوں سے پھوٹتی چاندنی، پراسرار پانیوں کے نیل، زمین کی

سوندھی سوندھی باس اور پھولوں کی قوسِ قزح سے تھرا تھرا جاتی ہیں۔

افق پہ پھوٹتی روشنی، جلتے گھروں کی لو۔

دھم،

یہ سب، اپنی گندم کا سونا، سرسوں کا نور، شرینہ، کیکر، شیشم کی ٹھنڈی چھاؤں اور کنواریوں کے بدنوں سے پھوٹتی چاندنی کے سامنے سینہ سپر، وار کرنے کے انداز میں انسانی بازو کی ہڈی کو فضا میں بلند کئے، سیاہ گھوڑے کے سوار کے منتظر ہیں۔

تو انسان، جلتے گھروں کی سرخ آگ کو آسمانوں پر شفق کی صورت پھیلا ہی دیتا ہے۔

خوشیوں کا باغ ۱-۲

جہنم میں جلنے والا ہر کوئی، اپنے چاروں اور لپکتی چنگاریوں کو گلزار بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔

تو رنگوں کی اس دنیا کے نیلے آسمان میں تڑپتی لہریں ہیں۔ سمندری مچھلیاں فضاؤں میں پرواز کرتی ہیں۔ بادلوں کو سمندر کی تہ جان کر ان میں افزائشِ نسل میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

افق سے ذرا اوپر، مخروطی عمارت، فضا میں معلق پیلے رنگ سے تعمیر۔ اس میں مختلف منزلوں پر گول کھڑکیاں، جن کے پار نیلا پرسکون آسمان نظر آتا ہے۔ پرندے، سیاہ، لمبی دموں والے، قدیم غار سے نکل کر ایک گول کھڑکی سے داخل ہوتے ہیں، دوسری کھڑکی سے نکل جاتے ہیں، دور آسمانی جھیل میں تحلیل، جھیل کی تہوں میں اترتے، جھیل کی تہوں میں ساکت پتھروں میں اپنے گھونسلوں میں سو جاتے ہیں۔

چاروں اور سے اٹھتی چار نہریں، آسمان کے نیل کو شیشے میں اتارتی، وسط میں آ کر جھیل کی صورت ایک ہو جاتی ہیں۔ اس جھیل کے عین درمیان زندگی کا فوارہ ہے پیازی، گوتھائی، مخروطی۔ نیلی گیند پر متوازن، جس کے مختلف کونے جھکی قوسیں بناتی ڈالیوں کی شکل اختیار کرتے ہیں جن پر جھولتے، کھلے، ادھ کھلے پھول، پراسرار پھول، ان چکھی لذتوں کے پھل، جن کی خواہش کرتے ہی، ذائقہ زبان پہ پھیل جاتا ہے۔ نیلی گیند کے گرد بنے شاہ نشین پر سفید بگلے، شاہ نشین سے چھلانگیں لگاتے مرد، عورتیں۔ اس فوارے میں بنی کھڑکیوں سے

HEIRONYMUS BOSCH. THE GARDEN OF DELIGHTS
(1510 - Ca) PANEL 1,2 (PRADO) MADR.

برہنہ مرد عورتیں نظر آتے ہیں، سیپ کے اندرونی حصوں ایسے ملائم، نرم شفاف، توس قزح میں لشکتے بدن، ایک دوسرے کو بازوؤں میں لئے، ایک دوسرے کو آنکھوں میں لئے۔

اس جھیل کے گرد، برابر کے فاصلوں پر چار اور چھوٹے چھوٹے گھر، اسی ہیئت، اسی تعمیر کے گھونسلوں میں بھی مسکراتی آنکھوں، چپ ہونٹوں پر ان کہی، سمجھ میں آجانے والی خواہشیں۔ برہنہ مرد عورتیں ایک دوسرے کو بازوؤں میں لئے، ایک دوسرے کو آنکھوں میں لئے۔

جھیل کے بالکل سامنے، درے، ذرا فاصلے پر گہرا نیلا، گول تالاب۔ اس میں کنواری دوشیزائیں مختلف ٹولیوں میں بٹی، نہاتی، اٹکھیلیاں کرتی۔ چند ایک کے سروں پر سیاہ کوتے سفید بگلے، نیل کنٹھ اور کنارے پر بیٹھی ایک کے سر پر مور بھی۔ تالاب کے کنارے پر ان کے گرد شیروں، چیتوں، ریچھوں، گھوڑوں، لوبیکارنوں پر سوار، پیدل برہنہ مرد عورتیں جلوس کی شکل میں جوانی کے تالاب کا طواف کرتے ہیں۔ فضاؤں میں وہ نغمے بکھرتے ہیں جو چاہنے والوں، چاہے جانے والوں کی سرگوشیوں سے جنم لیتے ہیں۔

رنگوں کی اس دنیا میں سب برہنہ ہیں، کوئی بھی برہنہ نہیں کہ سب کا لباس رنگ ہیں یا شاید برہنگی ایک دوسرے پر ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔

جھیل اور تالاب کے درمیان، ان کے اردگرد پھیلے، ٹولیوں میں، جوڑوں میں مرد عورتیں، ایک دوسرے کے وجود سے ظاہر ہوتے ہوئے، ایک دوسرے کے وجود میں تحلیل ہوتے ہوئے، شیشے کے کرتے، نصف کرے ان پر محیط اتنے نازک کہ سانسوں کی ٹھیس سے تڑخ تڑخ جائیں، انڈوں سے، پھلوں سے نکلتے، ان میں داخل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھلوں پھولوں کی ڈالیوں پر بیٹھے نیل کنٹھ، بلبلیں۔

وہ جیسے ابھی ابھی پہلی نیند سے جاگی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ جگانے والے کے ہاتھ میں ہے جس کے اٹھانے پر وہ اٹھ کر کھڑی ہو رہی ہے۔

نرم مخملیں گھاس پر وہ ایک ہاتھ ٹکائے دوسرا ہاتھ اپنی ران پر رکھے، ٹانگیں پسارے بیٹھا حیرت سے اس لڑکی کو تکتا ہے جس کا بدن اس کے اپنے بدن کی طرح جیسے پیاز کے

چھلکے سے بنا ہے، ساتویں آسمان سے بھی زیادہ شفاف، محبت کرنے والے دلوں سے بھی زیادہ نازک۔

وہ اس پر پڑتی پہلی نظروں میں اسے سمیٹ کر نظریں جھکا لیتی ہے۔

دونوں کو ایک دوسرے کے جسموں سے ایک دوسرے کی خوشبو آتی ہے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اپنی دنیا کی سیر کو نکل جاتے ہیں۔ ہاتھ میں پکڑے ہاتھ کو وہیں چھوڑ کر۔

جب لوٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان دونوں کے ہاتھوں نے ایک دوسرے کو تھامے ہوئے زمین میں جڑیں پکڑ لی ہیں، کومل، چکنی، گہری سرخ نئی نئی شاخیں پھوٹ پڑی ہیں۔ دونوں حیران رہ جاتے ہیں کہ ان کے وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے ہاتھوں کی آبیاری کس نے کی ہے۔

دونوں مسکرا دیتے ہیں کہ ان کا زمین میں بویا جانا بھی تو ضروری تھا۔

"—— سنو، میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنی رگوں، شریانوں کی جگہ انگور کی بیلیں اگاؤں"

لڑکی مسکرا دیتی ہے

"—— سنو، جب میں گہرا سانس لیتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے سامنے والے فوارے سے زندگی پی رہی ہوں۔"

محبت کرنے والے دلوں سے زیادہ نازک بدن، ساتویں آسمان سے زیادہ صاف و شفاف، وہ اپنے وجود کے تحیر میں، سامنے آسمان سے اتری جھیل میں چھوٹتے زندگی کے فوارے سے چھلکتی، چھوٹتی زندگی، زندگی کے تالاب میں نہائی، [illegible]، ابھرتی، تیرتی کنواری دوشیزاؤں کے گرد، شیروں، چیتوں، ریچھوں، گھوڑوں، یونیکارنوں پر سوار، پیدل، طواف کرتے مردوں عورتوں کے جلوس کی طرف بڑھتے ہیں۔

ابھی اس اور چند ہی قدم اٹھاتے ہیں کہ لڑکی یک دم رک جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تشویش کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتی ہے۔ لڑکی کے دل میں تیزی سے دھڑکتے آنسوؤں کے کھنکھنانے کی آواز لڑکے کے ہاتھ میں

سرایت ہو کر اس کے دماغ تک پہنچتی ہے۔ دونوں کی سمجھ میں نہیں آتا یہ کھنکھناہٹ کیسی ہے، اس کے معنی کیا ہیں۔ دونوں اسے سمجھنے کو آنکھیں موند لیتے ہیں۔

جب دھیان میں کچھ نہ پاکر آنکھیں کھولتے ہیں تو خود کو شیروں، چیتوں، ریچھوں، گھوڑوں، یونیکارنوں پر سوار، پیدل مردوں کے گھیرے میں پاتے ہیں تو فضاؤں میں وہ نغمے بکھر جاتے ہیں جو چاہنے والوں، چاہے جانے والوں کی سرگوشیوں سے جنم لیتے ہیں۔ جہنم میں جلنے والا ہر کوئی ایسے ہی خواب دیکھ کر، اپنے چاروں اور لپکتی چنگاریوں کو گلزار بنانے کے لئے اس طرح جدوجہد کرتا ہے کہ جسم کا جوڑ جوڑ، ریشہ ریشہ بھی پگھل جائے تو بھی آنکھیں ہمیشہ گاتی رہتی ہیں ——

خوشیوں کا باغ ۳

بوش کے خوشیوں کے باغ کا ہر پینل ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل، تیسری دنیا۔

دور افق پر ہر گھر آتش فشاں جس کی روشنی کھڑکیوں دروازوں سے پھوٹتی نظر آتی ہے۔ آگ کے پیش منظر میں یہ گھر — نہیں، کھنڈر، بلکہ گھروں کے بھوت دکھائی دیتے ہیں۔

گھروں سے بہتے لاوے کا سمندر، تاریکی میں بھی سرخ، جس میں ایک بہت بڑی کشتی جو یہاں سے چھوٹی سی دکھائی دیتی ہے، ابھی ابھی آگ اگلتے بازاروں، سڑکوں، گلیوں، گھروں سے بہتے سمندر بنتے لاوے میں اتری ہے۔ اس کشتی کا سرخ بادبان، چلتی ہوا سے یوں پھولا ہے جیسے حاملہ عورت کا پیٹ۔ یہ کشتی اپنے بطن میں لاتعداد زخمی، جلے ادھ جلے، ننگ دھڑنگ، پھٹے کپڑوں میں نیم برہنہ، بیمار، صحت مند، کمزور، تنومند مردوں، عورتوں، بچوں کو لے کر اس اور چلی ہے جس اور سے سورج نکلتا ہے۔

اس اور جس اور زرہ بکتروں والے، خودوں میں منہ چھپائے اپنے نیزوں بھالوں کی انیوں سے کچوکے دے دے کر دھکیل دھکیل کر اس شخص کو قید کر گئے ہیں جو کشتی والوں میں سب سے زیادہ طاقتور تھا، جس کے ہاتھوں میں کشتی کے سرخ بادبانوں کی رسیاں تھیں اور جس کے کشتی سے گھسیٹ لے جانے کے بعد ان گنت ہاتھوں نے وہ رسیاں تھام لی تھیں اور کشتی آہستہ آہستہ، دھیرے دھیرے چلتی ہواؤں سے حاملہ بادبان کو پھلاتی اس اور چل پڑی تھی جس اور سے سورج نکلتا ہے۔

HEIRONYMUS BOSCH : THE GARDEN OF DELIGHTS
(1510-Ca) PANEL 3, MUSICAL HELL, PRADO, MADRID.

حاملہ عورت کے پیٹ ایسے پھولتے بادبان والی کشتی ابھی اس سے بہت دور ہے۔
اس شخص سے بہت دور جسے اس تصویر کے وسط میں قید کر دیا گیا ہے۔ تصویر کا وسط
جواب ساری زمینوں کا مشرق ہے کہ سورج یہیں سے طلوع ہوتا ہے کہ یوش کا تیسرا پنیل
تیسری دنیا ہے، اس کی تاریخ بھی اپنی ہے اور جغرافیہ بھی اپنا۔ نقشہ نویس چاہے اس
حقیقت کو قبول کریں نہ کریں۔ یہ بوش کی دنیا ہے۔

تو وسط میں اس شخص کو قید کر دیا گیا ہے جس کے چہرے کا رنگ گندمی ہوتے ہوتے
دھوپ بن جاتا ہے اور جب اس کے چہرے پر دھوپ تمتتی ہے تو سورج۔ اس کے وجود
میں ان صحراؤں کی وسعت ہے جن پر چلتے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کے چلنے کی سرسراہٹ
بھی سنائی دیتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ان سمندروں کی گہرائی ہے جو ابلنے پر آتے ہیں تو
آتش فشاں پہاڑوں سے ابلتے لاوے اور جب سکوت اختیار کرتے ہیں تو بودھی کے درختوں کے
نیچے بیٹھے بدھ۔

سرخ بادبان والی کشتی کا ہر مسافر اس شخص کی طرح صحراؤں کا بیٹا ہے، سمندر پیے ہوئے
تو صحراؤں اور سمندروں سے گندھے اس شخص کے سامنے ہر شے ہے۔ ایک سو اسی
درجے کے بجائے تین سو ساٹھ درجے تک کی بھی کہ اس کی پشت پر نیزوں، بھالوں، کلہاڑیوں،
تیروں اور چھریوں کے واروں سے وہ نقشہ کھنچا ہے جس کے مطابق سرخ بادبانوں والی کشتی
کے مسافروں کی سمت اور منزل معین ہوئی ہے اور جسے حقیقت اور حق کے حصول کی خاطر
لوگ اپنے سینوں، اپنی پشتوں پر زمانوں سے کرب و بلا کی صورت کندہ کرتے آئے ہیں۔
اس کی پشت پر افق ہے جہاں آتش فشاں مکانوں اور اس کے درمیان لاوے کے
سمندر کو ایک پل سے پاٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس پل پر جانے کتنے برہنہ مردوں، عورتوں، بچوں کو زرہ بکتروں، خودوں میں چہرے
چھپائے اپنے نیزے بھالوں سے کچھ کے دستے، کلہاڑیوں سے وار کرتے انھیں پل پر آگے
بڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان سب سے آگے ایک گھوڑ سوار ہے، نیزے پر گدلے سے
رنگ کا جھنڈا چڑھائے۔ وہ ان سب کو پل کے آخر میں بنے مینار کی طرف لے جا رہا ہے

جس کی آخری منزل سے روشنی چھوٹ رہی ہے اور زمینی منزل سے اذیت دینے والے آلات کی چرخیاں نظر آتی ہیں۔ ان لاتعداد لوگوں میں سے بہت سوں نے پل پر سے لاوے کے سمندر میں چھلانگیں لگا دی ہیں۔ کچھ ڈوبتے اور کچھ جلتے بجھتے تیرتے کنارے کی جانب بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے کناروں پر پہنچ چکے ہیں اور خودوں میں منہ چھپائے زرہ بکتروں والوں کے نرغے میں آ چکے ہیں جو انہیں کچوکے دیتے ہوئے ایک جلوس کی صورت میں ڈھال لیتے ہیں۔ دور سے یہ سب کچھ چیونٹیوں کی طرح نظر آتا ہے خلقت کو نیزوں سے کچوکے دینے والے خودوں میں چہرے چھپائے زرہ بکتروں والے بھی اور خلقت بھی۔

جلتے گھروں میں جلنے والوں، پل سے لاوے کے سمندر میں چھلانگیں لگانے والوں اور نیزوں، بھالوں، کلہاڑیوں کے وار سہتے والوں کے منہ اگرچہ اذیت میں کھلے ہیں پر ان کی آہ و بکا، چیخ و پکار قطعی سنائی نہیں دیتی کہ کرب و بلا کی داستانوں کو جو آہ و بکا، چیخ و پکار کی صورت زمانوں پر پھیلتی رہتی ہیں، انہیں ہمیشہ الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے موجزن طربیہ نغموں میں یوں ہی ڈبونے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

اذیت میں کھلے دہانوں سے آہ و بکا، چیخ و پکار الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے موجزن طربیہ نغموں سے ابھر نہیں پاتی، اس لیے بھی کہ سرخ حاملہ بادبان والی کشتی کے مسافروں کا گیت ابھی شروع نہیں ہوا۔

کانوں کے پردے ریزہ ریزہ کر دینے والی الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے بہتی موسیقی، موسیقی کا جہنم۔

دور سے چیونٹیوں کی طرح نظر آنے والے جلوس کا رخ، دو بڑے بڑے جناتی کانوں کی طرف ہے، جن کے اوپر کے حصے سے تیر گزار کے زمین پر کھڑا کیا گیا ہے۔ ان کانوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ ہے جس سے پینتالیس درجے کے زاویے سے باہر نکلا جناتی ہی چھری کا تیز دھار پھل ہے۔ ایک عفریت اس کان کے نچلے حصے میں بیٹھا ایک برہنہ عورت کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کھینچتا ہے جیسے اسے کان کے چھید سے گذارنا چاہتا ہے۔ کانوں کے درمیان سے نکلی جناتی چھری کے تیز پھل کے نیچے سجدے میں گرے برہنہ جسم

جن کے آگے لانبی لانبی سبز گھاس، جس میں کٹی، تڑپتی، پھڑکتی زبانیں نظر نہیں آتیں ایک شخص ان دونوں کانوں کے درمیان سے نکل بھاگا ہے جس کو پکڑنے کی غرض سے کانوں کے درمیان ہی میں سے اس کے پیچھے بھاگتے عفریت کے ہاتھ بھاگنے والے کو چھوتے نظر آتے ہیں۔

ان کانوں کے بالکل پیچھے ایک گڑھا ہے جس میں آگ بھری ہے۔ آگ سے روشن اس گڑھے کے پچھلے کنارے پر پھانسی کا چوکھٹا گڑا ہے جس کے ساتھ سیڑھی لگی ہے۔ اس پر دو برہنہ شخص چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھانسی کے چوکھٹے پر ابھی پھندا نہیں ڈالا گیا۔

یہ سب حرکات سکنات، لانبی سبز گھاس میں چھپی، کٹی زبانوں کی تڑپ، جناتی کانوں کی طرف بڑھتے جلوس کی چاپ، پھانسی کے چوکھٹے کے ساتھ لگی سیڑھی پر چڑھتے دو شخص، پل پار کرتے لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے، نیزوں کے کچوکے سہ کر اذیت میں کھلتے دہن، یہ سب کچھ الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے بجتی موسیقی کے آہنگ سے بار بار بچھڑ جاتا ہے جسے نیزوں، بھالوں، کلہاڑیوں، کیل دار کوڑوں کی ضربوں سے بار بار اس آہنگ میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ سارا منظر، دیکھنے والوں کے کانوں کے اندر الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم کی صورت میں فٹ کر دیا گیا ہے۔

اس موسیقی کا منبع وہ سفید پڑتی پونگی ہے جو گول تختے کے وسط میں گڑی ہے۔ اس گول تختے کو اس شخص کے سر پر متوازن کر دیا گیا ہے جس کا خمیر صحراؤں میں جذب ہوتے سمندروں سے اٹھا ہے، جس کے عین سامنے آگ کے گڑھے پر پھانسی کا چوکھٹا لگا دیا گیا ہے اور جسے سرخ بادبان والی کشتی سے گھسیٹ کر تصویر کے وسط میں قید کر دیا گیا ہے۔ تصویر کا وسط جو تصویر کا مشرق ہے اور جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔

اس پونگی کے پیٹ پر بیٹھا انسانی جسم و شکل اور سینڈک ایسے بازوؤں ہاتھوں والا عفریت اسے تین تین انگلیوں سے بجاتا ہے۔ چوتھی انگلی پونگی کے پیچھے نظر نہیں آتی۔ پونگی سے امڈتی ہنگامہ خیز موسیقی پر نیل کنٹھ کے سر اور انسانی جسم والا عفریت ایک ہاتھ میں

بلیند ماسٹر یانہ ڈنڈا اٹھائے، دوسرے ہاتھ میں ایک برہنہ لڑکی کا ہاتھ تھامے یونگی کا طواف کرتا ہے۔ اس کے آگے اور اس کے پیچھے بھی ذرا فاصلے پر اسی قسم کے جوڑے ہیں جو یونگی کے سُروں کے ساتھ ہم آہنگ، کبھی بے تال، رقص میں یونگی کا طواف کرتے ہیں۔

تصویر کے وسط میں تیند شخص کے دائیں گال کا کچھ حصّہ ایک بہت بڑے بیضے کے پیچھے چھپا ہے جو سوکھے درخت کے تنے سے مشابہ دو ٹانگوں پر کھڑا ہے۔ درخت نما ٹانگوں کے پیر دو کشتیوں میں جمے ہیں اور یہ کشتیاں گٹر کے گدلے منجمد پانی کی جھیل پر ساکت ہیں۔ اس جھیل میں بہت سے لوگ، بہت سے عفریت، مختلف پرندوں کے چہروں والے، ہیبوں کے جوتے پہنے یا برف پر چلنے والی کشتیوں پر حرکت میں جامد نظر آتے ہیں۔ ایک برہنہ شخص گٹر کے گدلے پانی کی منجمد جھیل میں یوں الٹا معلق نظر آتا ہے کہ باہر صرف اس کی ٹانگیں انگریزی کے حرف وی کی صورت نظر آتی ہیں۔ جسم کا باقی حصہ گدلے پانی میں نظر نہیں آتا، دھڑ، بازو، نہ ٹانگیں اور نہ ہی داڑھی والا چہرہ۔ یہ سب یونگی سے اٹھتی موسیقی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بے تال نہیں، شاید اس لئے کہ ان تک پہنچتی موسیقی ان کے جسموں کے ریشے ریشے میں جامد ہو گئی ہے۔ ان سب سے الگ زرہ بکتروں والے اپنے عفریتی چہروں سے خود اٹھائے ہاتھوں میں گرز لئے ان پر پہرہ دیتے ہیں۔

کشتیوں میں کھڑی درختی ٹانگوں پر متوازن بیضے کا اگلا حصہ ٹوٹا ہوا ہے اور اس کے اندر لمبی میز کے گرد بیٹھے زرہ بکتروں والے اپنے اپنے سینوں پر ان اژدروں کے سروں کے تمغے سجائے دعوت اڑانے میں مصروف ہیں جنہیں انہوں نے اپنی مہموں میں سر کیا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان اژدروں کی شکلیں انہیں سر کرنے والوں کی شکلوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ایک برہنہ عورت انہیں کھانا کھلانے کی خدمت سرانجام دیتی نظر آتی ہے اور راہباؤں والا لباس پہنے دوسری عورت بیئر کے ڈرم سے مگ بھرتی دکھائی دیتی ہے۔ موسیقی کے سروں میں ان طالع آزماؤں کے قہقہے موسیقی کی شوریدگی میں اضافہ کرتے ہیں۔ اس سرائے نما جگہ کو زمین سے ایک سیڑھی جاتی ہے جس پر ایک شخص خود کے گرد چادر کو مکمل طور پر لپیٹے، دیکھنے والے کی طرف پیٹھ کئے، چہرہ چھپائے کندھے سے ٹکی

لاٹھی سے خالی مرتبان لٹکائے اتنی تیزی سے چڑھتا نظر آتا ہے جیسے خالی مرتبان کو طالع آزماؤں کی خواہشوں سے فوراً بھر لینا چاہتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک مسودہ ہے جو اس نے اپنے پیٹ کے ساتھ دبا رکھا ہے اور جو دیکھنے والے کو نظر نہیں آتا۔ اس کے چوتڑوں میں گھسے تیر کا باہر نظر آنے والا حصہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے پرانے زمانے میں لکھنے والوں کے قلم کا پر۔ سب سے نچلی سیڑھی پر تیتری کے پروں اور نیل کنٹھ کی چونچ والا عفریت ایک برہنہ مرد کو اوپر جانے سے روکتا ہے۔ اس مرد کے عین پیچھے داڑھی والا ایک برہنہ شخص زمین پر گھٹنوں کے بل جھکا زمین پر ہاتھ ٹکائے گھوڑا بنا ہے اور وہ اپنے سر کو بصد مشکل ٹیڑھا کر کے اپنی پیٹھ پر سوار اس راہبہ کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کی پیٹھ پر بیٹھی بیضوی سرائے کی طرف رخ کیے کوئی کتاب پڑھتی ہے۔ اس راہبہ سے پرے پچھلی طرف ایک غار سا ہے جس کی چھت ایک بہت بڑی کھوپڑی ہے۔ اس کھوپڑی کی ساخت سے پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہاتھی کی ہے یا گدھے کی۔ اس کھوپڑی سے ایک بہت بڑی گھنٹی جھولتی، ایک زاویے پر آ کے رک گئی ہے۔ اس گھنٹی سے ایک عورت کا برہنہ نچلا دھڑ نظر آتا ہے جو کہ گھنٹی کی حرکت کے ساتھ ٹکراتا ہے تو گھنٹی کی آواز اور اس عورت کی چیخ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ پونگی کی موسیقی میں جو کبھی کبھی سنگت کے طور پر گھنٹی کی چیخ سنائی دے جاتی ہے اس کا منبع یہی ہے۔ گھنٹی کے عین نیچے غار کی تاریکی سے لوگ جھانکتے ہیں جن کے حیرت زدہ چہرے اور برہنہ سوکھے جسم روشنی کی لال، سفید لکیریں اور جسموں کے نیل پر ٹمٹماتے سفید ستارے کبھی کبھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ جان یوں پڑتا ہے کہ یہ روشنی مغرب ہی کی سمت سے آ رہی ہے کہ نقشہ نویس مانیں نہ مانیں اس تصویر کا مشرق تصویر کے وسط ہی میں ہے۔

تصویر کے وسط میں قید اس شخص کا چہرہ انتہائی پرسکون ہے، صحراؤں کی وسعت اور سمندروں کی گہرائی ہے لیکن اس کے وجود میں وہ تمام چیخیں تڑپ رہی ہیں، وہ تمام اذیتیں تشنج میں مبتلا ہیں جنہیں موسیقی کے سیلاب میں ڈبونے کی کوشش کی جا رہی ہے تو اسی لئے اس کا ذہن، اس کا دل، اس کے جسم کا ریشہ ریشہ دوہرے عذاب میں گرفتار ہے،

چیخ و پکار، آہ و بکا اور الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے آتی موسیقی لیکن یہ سب کچھ دکھائی نہیں دیتا کہ تصویر کے وسط میں صرف اس کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

اب اس کی نظریں سامنے گڑی ہیں۔

اس کے بالکل سامنے تین ٹانگوں والی اونچی سی کرسی پر ایک عفریت بیٹھا ہے اس کے مینڈک ایسے جسم کو کھینچ تان کر انسانی شکل دی گئی ہے۔ ایک طرف سے نظر آتے چھوٹے چھوٹے پیلے طوطوں ایسی چونچ والے چہرے پر ایک بڑی سی گول آنکھ اندر کو دھنسی ہے۔ اس نے ایک گول ڈھول کو الٹا کر سر پہ تاج کی صورت پہن رکھا ہے۔ اس کے سینے کے گرد فیتہ لپٹا ہے جس سے اسی قسم کے تمغے لٹکتے ہیں جو یعقوبی سرائے میں داد عیش دیتے طالع آزماؤں کے سینوں سے لٹکتے ہیں۔ اس کی کھلی چونچ ایک عورت کا اوپر کا آدھا دھڑ نگل چکی ہے۔ باقی آدھے دھڑ کو اس نے ہاتھ سے، ران سے پکڑ رکھا ہے۔ اس برہنہ عورت کی رانوں کے اتصال کی جگہ سے پرندے نکل کر مائل بہ پرواز ہیں، کچھ ایسی افراتفری میں کہ ان کی پرواز کی سمت متعین نہیں ہوتی۔

الٹے ڈھول کا تاج پہنے اور سینے پر تمغے سجائے، اندر کو دھنسی گول آنکھ والا اس اور دیکھ رہا ہے جہاں لوگوں نے اس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی کو گانے سے انکار کر دیا ہے۔

تو اس موسیقی کا کمپوزر یہی الٹے ڈھول کے تاج والا ہے۔

موسیقی کی کھلی کتاب پر ٹکے مینڈولین کے بانسے کے ساتھ ایک شخص، مینڈولین کے دستے پر بیٹھے بہت بڑے چھپکلے کی دم سے بندھا ہے۔ موسیقی کی کتاب کے اوپر برہنہ چھاتیاں رکھے عورت جیسے ہاتھ باندھ کر اس کی منت سماجت کرتی ہے لیکن مینڈولین کے ساتھ چھپکلے کی دم سے بندھا شخص نہیں مانتا۔ چھپکلا اپنی تھوتھنی نما چونچ سے اس کے سر پہ ٹھونگے مارتا ہے اور اپنی دم کی گرفت اس کے گرد اور بھی کس دیتا ہے لیکن اس شخص کے حلق سے چیخوں کے سوا اور کوئی آواز نہیں نکلتی جسے فوراً موسیقی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔

مینڈولین سے نکلے بہت بڑے بربط کے تاروں سے ایک اور گلوکار، برہنہ تان کر باندھا گیا ہے۔ اس کے پیر ایک ورنگر سے جڑے ہیں اور بازو آسمان کی طرف الٹے زاویے

سے اٹھے ہیں جیسے وہ بربط پر مصلوب ہو اور آسمان کی جانب اٹھا لیے جانے کی خواہش رکھتا ہو۔ بربط ہی کے ایک تار سے بنا سانپ اسے بار بار ڈستا ہے اور زمین پر بیٹھا غار سے منہ کھولے خار دار عفریت کانٹوں کی چھڑی ہاتھ میں لیے ڈول کے تاج والے کی طرف ایک آنکھ دیکھتا چیخ کر مصلوب سے کہتا ہے۔

— گاؤ، کتے کے بچے گاؤ۔

لیکن وہ کتے کا بچہ نہیں کہ آس پاس کے کتوں کے بچوں کی طرح گانے لگے۔ اس کے حلق میں تمام سُر کانٹے بن گئے ہیں کہ اس کا گلا اس گیت سے بھر گیا ہے جو اس نے ہواؤں سے حاملہ سرخ بادبان والی کشتی میں بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ ہواؤں کو تیز کرنے کے لیے، اپنے جسم کے پٹھوں کو قوت سے بھرنے کے لیے۔

اور وہ سرخ بادبان والی کشتی اپنے بطن میں ان گنت زخمی، جلے ادھ جلے، ننگ دھڑنگ، پھٹے کپڑوں میں نیم برہنہ، بیمار، صحت مند، کمزور، تنومند مردوں، عورتوں، بچوں کو لیے ابھی لاوے کے سمندر کے وسط میں بھی نہیں پہنچی کہ ہواؤں کی رفتار مدھم ہے اور سرخ بادبان ابھی پورے تناؤ سے پھولا نہیں۔

ڈول کے تاج والا، غار ایسے کھلے منہ والے خار دار عفریت کی کارروائی کو داد و تحسین دینے کے انداز میں ادھ ننگی عورت کو ذرا اور نگل لیتا ہے۔

بینڈ ولین ہی کے نیچے ایک الٹی لیٹی برہنہ عورت کا نچلا دھڑ نظر آتا ہے۔ اس کے کولہے دو چھوٹے چھوٹے کچے گھڑوں کے پیندوں کی طرح نازک اور گول ہیں جن پر بڑی بڑی لاتعداد کالی بھڑیں اس صورت بیٹھی ہیں جیسے موسیقی کے حروف۔ یہ کالی بھڑیں اسے ڈستے جاتی ہیں۔ غار ایسے کھلے منہ والے خار دار کنڈکٹر کی چھڑی کے حکم پر بہت سے برہنہ مرد عورتیں جب ان حروف کو موسیقی میں ڈھالتے ہیں تو ان کی زبانوں سے، جو کہ اب لانبی سبز گھاس میں کٹی تڑپتی ہیں اور دکھائی نہیں دیتیں، ان سرخ کٹی تڑپتی زبانوں سے وہ راگ نکلتے ہیں جو زمانوں سے کرب و بلا کے میدانوں میں اسی قسم کے لوگ اپنے ساتھیوں کے لہو کے دھبوں کو پڑھتے گاتے آئے ہیں۔

یوں لگتا ہے جیسے تین ٹانگوں کی کرسی پر بیٹھے، الٹے ڈول کے تاج والے کی اندر کو دھنسی گول آنکھ خود بخود جھپکی گئی ہے۔

کہ باقی کے موسیقاروں کی صورتِ حال بھی یہی ہے۔ پینتالیس درجے کے زاویے پر اپنی پشت سے نفیری کو سہارا دیئے بنسری نواز، جس کی بنسری کا آدھا حصّہ اس کی پشت میں گھسیڑ دیا گیا ہے، نفیری کے گول منہ سے نکلتی آگ میں جلتا نفیری بجانے والا، ڈھول بجانے والا ڈھول کے اندر قید، جس کا پُر اذیت چہرہ ڈھول میں کھلی کھڑکی سے نظر آتا ہے کہ ڈھول پر بیٹھا ایک عفریت اپنی پوری قوت سے یہ ڈھول بجانے میں مصروف ہے۔ اس کے قریب ہی لکڑی کا ایک جناتی قامت کا ساز، جس کے اوپر نیم دراز برہنہ شخص ایک ہاتھ میں تیل کا پیالہ اٹھائے دوسرے ہاتھ سے جیسے اسے تیل دے کر گھماتا ہے، چرخی اور ہینڈل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موسیقی کا آلہ کم ہے اور کوئی اذیت دینے کا آلہ زیادہ۔ ہینڈل گھمانے والے کے پیچھے اپنی پشت پر ایک برہنہ شخص انڈہ اٹھائے سجدہ ریز ہے۔

اس ساز کے وسط میں بنی کھڑکی کے درمیان کھمبے کی اوٹ سے ایک عورت سر پہ چادر لئے جھانکتی ہے اور کھمبے کی دوسری طرف سے نکلے ایک ہاتھ میں لوہے کی پتلی سلاخوں سے بنے ترازو نما آلے کو بجانے کی خاطر دوسرے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی لئے نظر آتی ہے۔ یہ ترازو نما آلہ اس وقت بجایا جاتا ہے جب موسیقی میں لمحہ بھر، بالکل لمحہ بھر کا وقفہ آتا ہے۔ اگر یہ لمحہ نکل جائے تو ترازو بھی رہ جاتا ہے، چھڑی بھی اور موسیقی بھی۔ عورت کی آنکھوں پر اگرچہ پٹی بندھی ہے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی لگتا ہے کہ اس نے خاموشی کے اس لمحے کو، سوچ کے لمحے کو پھیلنے نہیں دیا بلکہ عین وقت پر داد طلب کامیابی سے ترازو کو لوہے کی چھڑی ماری ہے کہ ترازو نما ساز کا ایک پلڑا جھک کر ڈول کے تاج والے کے قدموں کا بوسہ لے کر اٹھتا دکھائی دیتا ہے۔ موسیقی کی کمپوزیشن کے ساتھ اتنی مہارت سے کئے گئے انصاف سے مطمئن ہو کر ڈول کے تاج والا ادھ ننگی عورت کو ذرا اور نگل لیتا ہے اور اس آنکھ سے کہ جو اس زاویے سے دیکھنے والے کو نظر نہیں آتی، اس شخص کو بھی دیکھ لیتا ہے جسے تصویر کے عین وسط میں قید کر دیا گیا ہے جس کا چہرہ اپنے وجود میں چاردں اور سے

رواں رواں ڈستی موسیقی کی اذیت کے باوجود پرسکون ہے کہ اس کا خمیر سمندروں میں صحراؤں کو گوندھ کر اسی لئے اٹھایا گیا تھا کہ یوش کی اس دنیا کے تمام اذیت کے ماروں کے لئے سورج بن کر روشن ہو۔

ڈول کے تاج والے کی نظریں اس چہرے کی تاب نہ لا کر خوفزدہ سی ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اعتماد کو اور سنبھالنے کے لئے الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم سے ابلتی موسیقی کو اور اونچا کر کے اس اور دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتا ہے جہاں ایک مستطیل کھڑے تختے کا سہارا لئے ایک برہنہ نوجوان زمین پر نیم دراز ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں خنجر گڑا ہے۔ سینے پر بہت بڑی چھپکلی سوار جس کی پیٹھ پر ایک پلیٹ میں کٹا ہوا ہاتھ منقش ہے جس میں چھری پیوست ہے اور کھڑی انگشتِ شہادت پر جوا کھیلنے والا پانسہ متوازن۔ اس نوجوان کی دائیں جانب زمین پر تاش کے پتے بکھرے ہیں۔ بائیں جانب تختے کی اوٹ سے سنہرے بالوں والی جس کی چھاتیاں فاختائیں ہیں، نظریں جھکائے تاسف سے اس نوجوان کو دیکھتی ہے۔ اس کے سر پر بھی وہی پانسہ متوازن ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جلتی شمع اور آبِ حیات سے بھرا جگ ہے اور بایاں ہاتھ اس چھری کی طرف بڑھا ہے جو پلیٹ پر منقش ہاتھ میں گڑا ہے۔ میز کے مستطیلی تختے کے پیچھے عجیب سی اذیت کے ہذیان میں مبتلا برہنہ مرد، عورتیں، عفریت اور زرہ بکتروں والے بھی۔

فاختاؤں ایسی چھاتیوں والی کے قریب ہی ایک سیاہ خرگوش بڑے اطمینان سے پائپ پیتا، قریب ہی سر کے بل کھڑی برہنہ عورت کو دیکھتا ہے اور اس کے آگے ایک نوجوان کو چیرتے پھاڑتے خار دار جسموں والے دو کتوں کو بھی۔

ڈول کے تاج والا پائپ والے خرگوش کی اس کارگزاری سے مطمئن ہو کر نیم گرم پانی سے بھرے دو مرتبانوں میں اپنے پیر ڈال دیتا ہے۔ اس کی تین ٹانگوں والی کرسی کی چھت سے نیلا سا ایک بہت بڑا غبارہ جھولتا ہے جو زمین میں بنے گٹر کے عین اوپر ہے۔ اس نیلے غبارے سے ایک برہنہ عورت ٹانگیں لٹکائے گٹر میں گرنے والی ہے، جو نیلے غبارے ہی میں ایک مرد کے پھیلے ہاتھوں سے پھسل گئی ہے۔ گٹر کے گول تاریک کنارے کے ایک

طرف ایک نیلا پڑتا برہنہ مرد قے کرتا نظر آتا ہے جسے ایک بڑھیا ہاتھے سے تھامے ہے، وہ اپنے پیچھے پیچھے اس بستر سے اٹھ کر آیا ہے جس پہ ایک نیلی پیلی پڑتی برہنہ عورت کہنی کے سہارے ہاتھ پہ ٹھوڑی رکھے نیم دراز اس مرد کو دیکھتی، صرف اس مرد سے ہی نہیں بلکہ ہر شے سے، ہر توقعے، ہر آواز، ہر شر سے بے تعلق ہے حتیٰ کہ گٹر کے کنارے کے دوسری طرف نظر آتے جسم کے اس حصے سے بھی جہاں رانوں کا اتصال ہوتا ہے اور جہاں سے اشرفیاں ٹپک ٹپک کر گٹر میں گر رہی ہیں اور اس برہنہ حاملہ لڑکی سے بھی بے نیاز جو گٹر سے ذرا ہٹ کر ڈول کے تاج والے کے جسم سے اتر کے خرگوش تک جاتی، اپنی سرخی کھو کر پیلی پڑتی دری کے سامنے میں تین ٹانگوں والی کرسی کی ایک ٹانگ سے ٹیک لگائے ٹانگیں پسارے بیٹھی ہے جس کی دودھ بھری چھاتیوں کے عین درمیان مینڈک چھپا ہے اور جسے سوکھی شاخوں ایسی انگلیوں والا پیلاہٹ مائل سبز رنگ کا عفریت آغوش میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ ان دونوں کے عین درمیان گہرے نیلے رنگ کا گدھا سر اٹھائے انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔

شاید اس بستر پہ کہنی کے سہارے نیم دراز برہنہ نیلی پیلی پڑتی عورت ان سب سے بے تعلق نہیں بلکہ بے حس ہو چکی ہے۔ شاید مر چکی ہے کہ اسے نچلے کونے میں مستطیل تختے کے منظر کے سامنے بیٹھے ایک برہنہ مرد کا بوسہ لیتی ہوئی سورنی بھی نظر نہیں آتی جس نے راہباؤں ایسے کپڑے سے سر کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اس مرد کی رانوں پہ ایک کاغذ پڑا ہے جس پہ سورنی اور مرد، دونوں کے ہاتھوں میں تھمے قلم نے کچھ تحریر کیا ہے۔ قلم اب سورنی کے ہاتھ میں ہے۔ سورنی کے پیچھے پھیکے پڑتے گلابی لباس میں ایک شخص دائیں ہاتھ سے سر پہ رکھی تختی سنبھالے تجسس میں منہ کھولے انہیں دیکھتا ہے اور سامنے نیلے رنگ کا خاردار خود پہنے پستہ قد، خاردار دم والا عفریت یوں تشکیک کی نگاہوں سے انہیں دیکھتا ہے جیسے کاغذ پہ لکھے گئے اس معاہدے میں کوئی ہیر پھیر تو نہیں ہوا جو ابھی ابھی سورنی نے اس برہنہ مرد کے ہونٹوں پر بوسے کی صورت تحریر کیا ہے۔ یہ کونہ بھی وقتاً فوقتاً سامنے والے کونے کی طرح تصویر کے مغرب میں کہیں سے آتی روشنی کی لال، سفید لکیروں سے روشن ہوتا رہتا ہے اور کبھی عفریت کے نیلے خاردار خود پہ جلتے بجھتے سفید ستاروں سے۔

ڈول کا تاج پہنے تین ٹانگوں والی اونچی کرسی پر بیٹھا شخص اس لئے اطمینان سے بیٹھا، رفتہ رفتہ اپنی کھلی مٹھی میں پھنسی عورت کو ایک ہاتھ سے، ران سے پکڑے رفتہ رفتہ نگلتا رہتا ہے کہ اس کی ترتیب دی ہوئی موسیقی کے عفریتی کنڈکٹر سے لے کر پائپ والے خرگوش تک اور خود دل میں چہرے چھپائے زرہ بکتروں والوں سے لے کر سارے وجود کو چادر میں لپیٹے، سرائے کی سیڑھیاں چڑھتے، پشت میں ٹھکے قلم کے پر والے تک سب الیکٹرانک سسٹم سے ابلتی موسیقی کے سُروں کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور جو نہیں ہیں وہ اس جہنم میں موت کی خواہش لئے تڑپتے ہیں۔ وہ مطمئن ہے کہ تصویر کے مغرب میں کہیں سے آتی روشنی کی سفید، لال لکیریں اور نیلے آسمان پہ جھلملاتے سفید ستارے اس کی راہ کو متعین کرتے ہیں۔

لیکن ڈول کے تاج والے کو یہ معلوم نہیں کہ الیکٹرانک ساؤنڈ سسٹم پہ موسیقی کو چاہے کتنا ہی بلند کر دیا جائے اس میں دوسری آوازیں دب تو سکتی ہیں پر مٹ نہیں سکتیں۔

اور پھر آنکھیں دیکھنے کے لئے ہوتی ہیں سننے کے لئے نہیں۔

دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ تصویر کے مشرق کی بائیں طرف عمودی انداز میں کھڑی چھری کی دھار پہ لیٹے سوکھے سے برہنہ جسم نے ایک اور گول تختہ اٹھا رکھا ہے، جس پر جانے کس اور سے آئی ہوئی، شیروں ایسی دہشت رکھنے والی مخلوق نے بہت سے زرہ بکتر والوں کو حفاظتی کمرے سے گھسیٹ کر باہر نکالا ہے، انہیں اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے، چند ایک نے ایک زرہ بکتر والے کو گرا کے اس کا خود اتار پھینکا ہے اور اسے نوچنے لگے ہیں۔

اور دیکھنے والے اس تصویر میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کشتی کا سرخ بادبان اب تیز ہوا اور سے پورے دنوں کی حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہے۔ وہ کشتی اپنے بطن میں لاتعداد زخمی، جلے ادھ جلے، ننگ دھڑنگ، پھٹے کپڑوں میں نیم برہنہ، بیمار، صحت مند، کمزور، تنومند مردوں، عورتوں، بچوں کو لئے جن کے ہاتھوں میں ان کے جسموں میں پھیلے فاقوں کے ہتھیار ہیں، جلتے گھروں سے بہتے لاوے کے سمندر میں تیزی سے اس اور بڑھتی ہے جس اور سے سورج نکلتا ہے جہاں مغرب میں کہیں سے آتی لال سفید دھاریوں اور نیلے

آسمان پر جگمگاتے ستاروں کی روشنی کو تھامے ڈول کے تاج والے نے اپنے زرہ بکتر والے رولوں کے ہاتھوں اس شخص کو قید کرایا ہے جس کے چہرے کا رنگ گندمی ہوتے ہوتے دھوپ بن جاتا ہے اور دھوپ جب اس کے چہرے پر سمٹتی ہے تو سورج، جس کی جوہری توانائی سے دہشت زدہ ہو کر ڈول کے تاج والے کے حلق میں لڑکی کا نٹے کی طرح پھنس جاتی ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا' اب کیا کرے؟

اور اب تو دیکھنے والے سنتے بھی ہیں کہ الیکٹرونک ساؤنڈ سسٹم سے طوفان کی طرح اُمڈتی جیمنی موسیقی کو چیر کر وہ سُر تیزی سے سر اُٹھانے لگتے ہیں جو لابنی سبز گھاس میں کٹی' تڑپتی سرخ زبانوں پہ دم سادھے تھے' بربط پہ مصلوب گلوکار کے حلق کے کانٹے' زبانوں پہ پھیلے کرب و بلا کی داستانوں کے حروف جنہیں حقیقت اور حق کے حصول کی خاطر لوگ ہمیشہ سے اپنی پشتوں پر کوڑوں' نیزوں' بھالوں' تیروں سے کندہ کراتے گاتے آئے ہیں، اب ڈول کے تاج والے کے لئے صورِ اسرافیل کی صورت' سرخ بادبان کشتی کے مسافروں کا گیت بن چکے ہیں۔

گیت گاتے کروڑوں فاقہ مست جن کے جسموں میں تصویر کے مرکز کا قیدی دھوپ کی حرارت بن کر منقسم ہوا ہے' وہ شخص کہ جس کے وجود میں کروڑوں فاقہ مستوں کے جسموں کی دھوپ سمٹ کر سورج بنی ہے'

سورج' جسے ابھی اس تصویر کے وسط سے طلوع ہونا ہے'

تصویر کا وسط جواب ساری دنیا کا مشرق ہے۔

نقشہ نویس مانیں نہ مانیں یہ ان کا نقشہ نہیں' ہوش کی بیٹھک ہے'

خوشبوؤں کا باغ'

جس کا ہر پینل ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل' تیسری دنیا۔